

اکٹھی اے اک جاہ

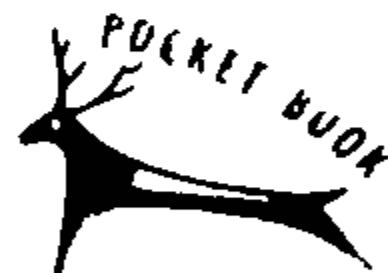
امرتا پرینیم





امرتہ پرستیم

ایک لڑکی اور ایک جام میں کیا فرق ہے۔
بہت کچھ
اور کچھ بھی نہیں
اس نے بھی ہر لڑکی کو ایک جام سمجھا۔
بریز کیا۔ ہوتھوں سے لگایا اور توڑ دیا۔
لیکن وہ اس کی زندگی کا آخری جام ثابت
ہوئی۔ مگر وہ جام اس کے ہوتھوں تک
آنے سے پہلے ہی چین گیا اور وہ زندگی بھر
آنسو بھا تارا۔
ایک لڑکی ایک جام، امرتہ پرستیم کی چیدہ
چیدہ کہا نہیں کہا جو عہد ہے۔





ایک جیسا

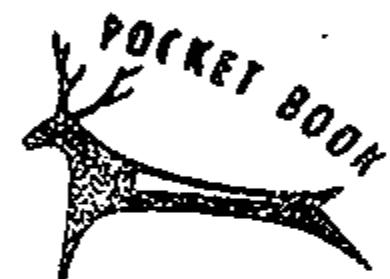
امن پرستم

افانے



مشورہ بک ڈپو

رام نگر - گاندھی نگر - پوسٹ بکس ۱۴۲۹ دہلی ملا



قیمت فی کتاب ایک روپیہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر:- مشورہ بگڈ پو

رام سحر گاندھی محر پوسٹ بکس ۱۷۳۹ دلی ۶

مطبوعہ - دہلی پرمنگ درج

EAK LADKI EAK JAAM—AMRITA PREETAM
STORIES

ایک لڑکی ایک جام

مشہور مصور سمیش نندائی یہ کہانی دراصل میں
لنے پچھلے برس لکھی تھی۔ دلی میں اُن کی تصویروں کی نمائش
ہو رہی تھی۔ ہفتہ بھر لگا تارکسی نہ کسی اخبار میں اُن کے فن
پر تبصرہ شائع ہوتا تھا۔ بڑے بڑے دانشور یہ تقریبی
تنقید لکھتے تھے۔ مجھے فنِ مصوری سے متعلق صرف اتنی
ہی واقفیت تھی جتنا کہ فن سے بے بہرہ مگر حساس شخص کو
ہوتی ہے۔

نمائش میں رکھی گئی تصویروں کی خاموشی سے
تعزیت کرتے ہوئے میری آنکھیں سمیش نندائی دو تصویروں
پر جنم کر رہ گئیں۔ ایک تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ ”ڈھانی^۱
پتیاں، ڈیڑھوپتی۔“ اور دوسری تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

”ایک لڑکی ایک جام“

پہلی تصویر چائے کے باغ میں چائے کی پتیاں پختی ہوئی دو پہاڑی دو شیزادوں کی سخنی اور اس تصویر کا مفہوم مصوّر نے کچھ لیاں سمجھا یا اتنا۔ ”چائے کے پودے کی آخری کونسل صرف ڈیر ڈھپتی ہوتی ہے۔ ایک پوری پتتی اور اس سے جڑی ہوئی ایک پتتی سی پتتی۔ اس ڈیر ڈھپتی کی آپ و تاب فراموشی ہی ہوتی ہے۔ اس آخری کونسل کے نیچے ڈھافی پتیاں اگتی ہیں۔ نہایت زم اور پھر اس سے نیچے موٹی پتیوں کی کئی ڈالیاں ہوتی ہیں۔ ڈھافی پتیاں اور ڈیر ڈھپتی توڑکر الگ رکھ لیتے ہیں۔ ان پتیوں سے جو چائے بنتی ہے وہ بہت فہنگی ہوتی ہے۔ ہم لوگ جو چائے پیتے ہیں وہ موٹی پتیوں کی ہوتی ہے۔ ایک ایک ثابت و سالم پودے سے چائے کی صرف چار نشان پتیاں اُترتی ہیں۔ سارے باغ سے آخر کتنی پتیاں حاصل کی جاسکتی ہیں؟ وہ چائے سماں روپے پونڈ سے بھی فہنگی ملتی ہے۔ سینیش نندا کی تصویر میں ادھر جو پہاڑی دو شیزادی کا چہرہ نصف سے بھی کم دکھافی دیتا تھا۔ دیکھنے والے کی طرف اُس کی پیچھوئی سخنی۔ لیکن پھر بھی اُس کے حسن کا جوانہ نظر آتا تھا، اس سے یوں معلوم ہوتا تھا چیز تکام پہاڑی دو شیزادیں چائے کا ایک پودا ہوں... پکھرا اور

پھیلا ہوا پودا۔ اور اس طرف کھڑی ہوئی وہ رُٹکی جیسے اُس پودے کی آخری کونسل تھی.... مگر میں نے اپنی یہ رائے اپنے دل بی میں محفوظ رکھی اور مصتور سے کچھ نہ کہا۔

دوسری تصویر جس کے نیچے ایک رُٹکی ایک جام۔ لکھا تھا، پہٹاڑی دو شیزوں کے انوکھے حسن کی حامل تھی۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں ”مسنہ بولتی تصویر“ سچ مجھ میں نے ایسی مسنسنہ بولتی تصویر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے باعث میں مصتور نے کوئی وصف احتساب پیش نہیں کی تھی۔ میں نے یہی کہا ”ایسا جام پینے کے لئے ایک عمر بھی کہہتے“

مصطفور نے ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا۔ مصتور کی عمر سالہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ نہ جانے شباب کا کون سا عالم ابھر کر اس کی آنکھوں میں آگیا تھا۔ وہ بولا۔ ”اس تصویر کی آج تک ایسی ترجمانی کسی اور نہیں کی۔ یہ تو دراصل وہی بات ہے جسے میں کہنا چاہتا تھا.... اور تو اور میں کے احباب نے بھی اس تصویر کے یہ معنی نہیں نکالے۔ کچھ لوگ مجھ سے مذاق کر کر رہے ہیں۔“ ایک رُٹکی ایک جام۔“ جام تو ہر روز نیسا بیسر آ سکتا ہے۔“

نہ جانے اس تصویر میں کون سی کشمش سمجھی
کہ نماش ہفتہ بھر رہی اور میں وہ نماش تین بار
دیکھنے کی — دراصل وہ نماش ہی ”ایک لڑکی،
ایک جام“ تھی۔

وہ کوئی فتنی اور شوری بابت نہیں تھی۔ میں نے
اپنے دل سے اٹھی ہوئی ایک سادہ سی بات سمجھی
شندکی تخلیق سے متعلق کہہ دی تھی۔ یہ سادہ سی بات
مصور کا دل ٹھوٹ کر اس کے ہونٹوں پر لے آئی۔

”میں کانگڑا کے فنِ مصوری کی تحقیق کے لئے
ایک گاؤں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ پالم پور کے چائے کے
باغات کچھ زیادہ دور نہیں سمجھتے۔ یہ تصویر“ رہائی پتیاں
ڈیڑھ پتی“ میں نے وہیں بنتائی تھی۔ یہ لڑکی جو اس
طرف تھری ہے، دراصل وہی لڑکی ہے جسے میں نے دوسری
تصویر ”ایک لڑکی ایک جام“ میں دکھایا ہے۔“

”یہ بات تو میں نے آپ کے پتا نہیں سے پہلے
نہیں پہچانی تھی۔ میکن پہلے ہی دن یہ تصویر دیکھ کر مجھے یوں
محوس ہوا تھا جیسے نام لڑکیاں چائے کا پودا ہوں۔
اور یہ لڑکی اس پودے کی بالائی کو نیل ہو سبز، نہیں،
اور چمکتی ہوئی۔“

سمیش نہ کی بُڑھی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی
اور آنکھوں نے کہا۔ ”اب تو مجھے اور بھی یقین ہو گیا
ہے۔ تم نے تو مجھ سے میرے کردار کی بات کہلوالی ہے
تم نے جس انداز میں میری دونوں تصویروں کا مطلب
بیان کیا ہے اس سے میری کہانی سُننے کا تھیں
حق حق اصل ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے میری کہانی کوئی
نہیں سُن سکا۔“

”میں نے اس لڑکی کو ”ٹونی“ کے نام سے پکارا
تھا۔ میں نے اس کا اصل نام پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں
کی تھی۔ اس نے چائے کی پتیاں پختنے ہوئے ”ڈھائی
پتیاں اور ڈرڈھ پتی“ والی بات مجھے سُننا تھی اور میں
نے اس سے کہا تھا کہ تو بھی تو ان دو شیراؤں کے پودے
کی بالائی کو نیل ہے۔ بہت صینگی۔ خبر نہیں یہ
چائے کون پیے گا؟“

”برکات کے دن تھے۔ ایک نالے میں
بارہ آگئی اور آس پاس کے دیہات کو آپس میں ملانے
والی سڑک نر آب ہو گئی۔ تین روز کے بعد اس
سڑک کا بدن دکھانی دیا۔ ادھر سے میں جا رہا تھا، اور ادھر
سے ٹونی آرہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”آخر بارش ستمہ ہی گئی

ایک پارتو یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہ طفیلی رُ کے گی نہیں۔

کچھ خبر ہے کہ ٹوپی نے کیا کہا۔ ”بابو! یہ بھی کوئی انسان کے آنسو ہیں جو کبھی خُشک نہیں ہوتے۔“

میں ٹوپی کے مُنہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اُس کی صورت بے حد حسین تھی۔ وہ ایسی بات سمجھی کہہ سکتی ہے، میں یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسی بات میں نے ایک بنگالی ناول میں پڑھی تھی۔ مگر ٹوپی نے تو کبھی بنگالی ناول نہیں پڑھا تھا۔ شاید سارے دلشیوں کے دکھ کی ایک ہی زبان ہوئی ہے۔

میں اُس کے گھر بھی گیا۔ اس کا باپ تھا۔ ماں تھی، بہن تھی۔ وہ بھائی تھے۔ ایک بھائی تھی۔ میں نے اُس کے سارے گھر کا اچھی طرح چائزہ لیا۔ یہ بات نہ چانے اس کے دل کے کس گوشے سے اُبھری تھی۔ میں نے اس کے دکھ کے بیچ ڈھونڈ لیے۔ اس کے باپ کے صریر قرض نہ کا بھاری بوجھ تھا۔ وہاں لڑکیوں کی قیمت پڑتی تھی۔ میں چار صور و پلے سے ایک ہزار روپے بنک۔ اور ایک قرض خواہ نے چند رہ صور و پلے کے

پر لے میں اُسے انگ لیا تھا۔ لُون کہتی تھی۔ ”وہ انسان نہیں دیو ہے۔ مجھے خواب میں بھی اس سے خوف آتا ہے۔“

ایک دن میں لُون سے تنهائی میں لوچھا ”اگر میں تم سے خوف کے بندھن کاٹ دوں تو ہے؟“ ”وہ کیسے یابو؟“

”میں پندرہ سور و پلے دئے دیتا ہوں۔ تم اپنے باپ سے کہہ کروہ منگنی تو ڈردو۔“

اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو میں سے کہہ پاؤں پکڑ لیتی۔ مگر لُون نے سیدھا میں سے دل پر ہاتھ ڈال دیا اور کہنے لگی۔ ”بابو! کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟“ کبھی میں نے کہا تھا۔ ”لُون تو چاہئے کے پوچھے کی بالائی کونپل یعنی سب سے بیش بہا کو نپل ہے۔ بہت ہی صہنگی۔ خبر نہیں یہ چاہئے کون پئے گا؟“ اور آج لُون نے اپنی ہٹ دھرمی سے اس پتی کی چاہئے تیار کر دی تھی۔ میں نے یہ بات نہ سوچی تھی نہ کہی تھی۔ میں نے اُسے سمجھا تھا کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ لیکن اُس کے تین بدن میں آگ لگ گئی اور اُس نے

کہا۔ ” باپو! کیا میں سمجھ کارن ہوں؟ ”
 میری اپنی زندگی بھی کچھ اچھی نہیں تھی کتنی
 ہی لڑکیاں میری زندگی میں آئی تھیں اور جبکی
 گئی تھیں۔ میں صرف تھوڑی دُور تک ہی ان کے
 ساتھ چل سکتا تھا۔ ان کے ساتھ طویل مسافت
 طے نہیں کی تھی۔ اور اب میرا اعتماد ہی اٹھ چکا تھا۔
 کہ میں زندگی سمجھ رکھی کا ہم سفر ہو سکوں گا۔

” میری زندگی بہت گرم ہے۔ ٹوپی تو اسے
 نہیں پی کے گی تیکر ہونٹ جھلس چائینگے ۔“ اور میں
 نے اس کا دل رکھنے کے لئے اُس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی
 ” میں پھونک پھونک کر اسے پی جاؤں گی باپو۔“
 میں نے اُس کی یہ بات سُنبھلی۔ اُس گھر تھی اُس
 کے چہرے کا جواندراز تھا اُس سے مجھے محسوس ہوا کہ یہی وہ
 ٹوپی ہے جس کے ساتھ میں زندگی کی طویل مسافت طے کر
 سکتا ہوں۔“

لپتے فصلہ کو میں نے چاندی کے سکے کی طرح ڈنگا کر
 دیکھا۔ میں نے کہا۔ ” تمہیں شاید معلوم نہیں میری زندگی میں کتنی
 ہی لڑکیاں آچکی ہیں۔ ہر ایک لڑکی کو میں نے شراب کے چام
 کی طرح پیا اور اپنا چام شراب سے دوبارہ لبر نہ کر لیا۔“

وہ ہنس پڑی اور بولی۔ ”کیوں پابلو! کیا تمہاری پیاس نہیں بھجتی؟“
 میں نے اُس سے کچھ نہ کہتا اور وہ بولی۔
 ”بہت اچھا بابو۔ ایک بار جب ام بھلو اور جب تک میسے دل کا یہ جسم ختم نہ ہو جائے تب تک کسی اور جسم سے اپنے ہونٹ نہ لگانا۔“
 مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے اب تک چلنے جسم پر سختے وہ اجسام کے جسم سختے دل کے جسم نہیں سختے۔ اگر کوئی ایسا جسم ہوتا تو پھر جب تک اُس کی شراب ختم نہ ہو جاتی تب تک میں کسی دوسرے جام سے منہ نہ لگا سکتا۔ شاید دل کے جسم کی شراب کبھی ختم نہ ہوتی۔
 میں نے اپنے فیصلہ کا روپیہ ٹنکا کر دیکھ لیا تھا۔ لوٹنی کا فیصلہ تو درست تھا ہی، لوٹنی کے ماں باپ نے ہم دونوں کا فیصلہ تسلیم کر لیا۔ اور میں روپوں کا انتظام کرنے کے لئے شہر والپس آگیا۔

سمیش نہدا نے جب اپنی کہانی کا آغاز کیا تھا تو اُس وقت آٹھ بجھے واسی تھے

آٹھ بجے نمائش کا وقت ختم ہو جاتا تھا۔ اس لئے تصویریں دیکھنے والے لوگ لوٹ گئے تھے۔ کسی نے شخص کو وہاں آنا نہیں تھا۔ کہانی اپنے اخream کو نہیں پہنچی تھی۔ مگر کہانی کو وہاں تک لا کر مصتور نے اُسے دہیں روک دیا تھا۔ میں مصتور کی طرف دیکھتی رہی۔ رُکی ہوئی اس کہانی کے بارے میں سوچتی رہی۔ مصتور جیسے بخوبی کے عالم میں کھو گیا تھا۔

چپٹا سی نمائش گاہ کا دروازہ بند کرنے کے لئے دہیز میں آکھڑا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کی تدبیحہ کی اور انتظار کرتی رہی کہ شاید رُکی ہوئی کہانی آگے چل پڑے۔ مصتور کی بند آنکھوں میں آنسو اُمّا آئے تھے اشکوں کی روائی نے کہانی کو بھی آگے بڑھا دیا۔ ”میں جب روپے لے کر واپس گیا تو قسمت میرا جام میرے بانشوں سے چھین چکی تھی۔“ ”وو کیا باپ نے لوٹنی کا درپرداز بیاہ کر دیا تھا؟“ میں نے کاپنے ہوئے پوچھا۔ ””نهیں! اس سے زیادہ بھی انک حادثہ

ہوا۔ لوٹنی جس شخص کو دیو کہا کرتی تھی اُس سا ہو کار
لے اپنا مسودا ٹوٹنے کی خبیرتیں لی تھی اور اُس
لے دھوکے سے کسی کے ہاتھوں لوٹنی کو زہر پلوادیا تھا۔

”لوٹنی کی چلتا میں ابھی کچھ آنج باقی تھی۔
خھوڑی سی آگ۔ میں نے اُس آگ کو گواہ بنایا اور چتا
کے گرد گھوم کر جیسے پھیرے لے لئے ...“

تصور نے شاید تیس پینتیس برس کی عمر میں
وہ پھیرے لئے ہوں گے۔ اگلے تیس برس تک نہ جانے
کیسے اس نے ان پھروں کی لاج رکھتی ہوگی۔ یہ بات
اس کے ساٹھوں برس سے بھی صاف ظاہر ہو رہی تھی
پوچھنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا
جیسے یہ بیسویں صدی اسے سلام کرنی ہو۔ آہستہ آہستہ
تصور کے ہونٹ پھر کے۔

”لوٹنی نے کہا تھا۔ ایک اقرار کرو بالو۔ جتنی دیر
تک میں کر دل کا حبام ختم نہ ہو اتنی دیر تک
کسی اور حبام سے اپنے ہونٹ نہ لگانا.... اور
وہ سامنے کھڑی ہوئی لڑکی گواہ ہے کہ میں نے کسی
اور حبام سے ہونٹ نہیں لگائے۔“

سامنے لوٹنی کی تصویر تھی۔ — لوٹنی —

”ایک رُٹکی، ایک جام“ موت نے مصوّر کے ہاتھوں سے وہ جام چھین لیا لیکن کوئی موت اُس کے تصور سے وہ جام نہ چھین سکی۔ اور مصوّر کی ساری عُوْج اُسے پیتے گزرنگی۔ اس صراحی کی شراب ختم نہ ہوئی۔

لگ بھگ ایک پرس ہو چکا ہے۔ میں نے سمیش نندا کی زبان سے یہ کہانی سنی تھی۔ اور پھر اگلے ہفتہ اُسے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ لیکن انہوں نے مجھے اسے چھاپنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس وقت میں نے کہانی میں ان کا نام بدل کر لکھا تھا۔ مگر انہوں نے کہا تھا کہ جب تک میری عمر کا آخری دن نہیں آتا تب تک میرا اس پر کوئی حق نہیں۔ اس جام کو پیتے ہوئے مجھے آخری سالس لیتے دو۔ پھر اس کہانی کو شائع کرنا۔ ابھی نہیں۔ اس وقت میرا نام بھی بدل کر لکھتا۔

پھر ہفتہ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوا گا۔ ”مشہور مصوّر سمیش نندا وفات پا گئے۔“ مصوّر کے فن سے متعلق اخباروں نے یہ بھی لکھا تھا۔ ”جس کرے میں مصوّر نے آخری

سانس لیا، اس کرے میں صرف ایک ہی
تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔۔۔ ”ایک رٹکی، ایک جام“
عمر سچ رحموں تھی۔۔۔ جام بڑا تھا۔۔۔ آج
مصور کا وہ دعویٰ درست ثابت ہوا۔۔۔ میں نے اس
کہانی میں کوئی تبددیلی نہیں کی۔۔۔ صرف ان کا اصل
نام لکھا ہے ان کے کہنے کے مطابق۔۔۔

لال مرچ

”ڈاکٹروں کے انجکشن کو چھوڑ دیا رہ جس گھر کے گئتنے کا ٹاہے اُس گھر کی لال مرچیں اپنے زخم پر لگاؤ۔“ ایک دوست نے کہا۔
”جس گھر کے گئتنے کا ٹاہے، اگر اُس گھر کی کوئی خوبصورت لڑکی تمہارے زخم پر پٹی باندھ دے... لڑکیاں بھی تو لال مرچ ہوتی ہیں۔“ دوسرے دوست نے کہا۔

کالج کے نہام دوست لڑکے ہنس پڑے۔
اور وہ جسے گئتنے کا ٹاٹھا ہنس کر کہنے لگا۔ ”یار سنخہ تو اچھا ہے، مگر یہ تمہارا آزمودہ ہے نا؟“

گوپال نے عمری اٹھا رہویں سیڑھی پر پاؤں رکھا ہوا تھا، اور گوپال کو محسوس ہوا کہ اس سیڑھی پر جوانی کے احساس کا ایک گستاخ دیکھ رہا ہوا تھا، اور آج اُس نے اچانک پاگلوں کی طرح اٹھ کر اُس کی ٹانگ

میں سے گوشت نوج لیا تھا۔ اس روز سے گوپال کا دل اپنے زخم پر لگانے کے لئے ایک لال مرچ جیسی لڑکی تلاش کرنے میں لگ گیا تھا۔
 لڑکیاں تو گوپال کے کارچ میں بھی تھیں، پڑوس کے گھروں میں بھی، اُس شہر کی لڑکیوں میں بھی، اور دوسرے تمام شہروں میں بھی۔
 ”مگر جس لڑکی کو میں تلاش کر رہا ہوں وہ کون ہے؟“ گوپال اکثر یہ سوچتا۔
 اور پھر گوپال لڑکیوں کو ایسے دیکھتا جیسے نفاذی میں دال کو چینا جاتا ہے۔ چھوٹے قدمی میوٹ چپٹی ناک دالی۔ لمبی گول مٹوں۔ اور جب ایسی لڑکیوں کو وہ دال میں کنکروں کی طرح چمن لیتا تو اُسے تمام پُرانی تشبیہیں یاد آ جاتیں۔ لچکتی ہوئی تھنی جیسی لڑکی۔ چندن جیسی لڑکی۔ دیودار کے پڑی جیسی لڑکی۔ چاند کی پھانک جیسی لڑکی.... اور پھر گوپال سوچتا
 ”کوئی بھی نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ مجھے تو صرف لال مرچ جیسی لڑکی چاہیے۔“

دلیسے تو کارچ کے تمام لڑکوں میں کتابوں اور کوس کے بجائے لڑکیوں کی باتیں لمبی ہو گئی تھیں۔ مگر گوپال کی ہر بات کو جیسے ”لڑکی“ لفظ کے دروازے میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ کبھی ریڈیو پر لورچہاں کی آواز آتی ”تیرے مکھڑے پہ کالا کالا تلے کے۔۔۔ او مُندِ اسیال کو طیا۔۔۔ تو گوپال اپنے لال ہونٹوں پر ایک موڑے کا لے تل کو انگلی سے ٹوٹ لئے لکھتا اور پھر جیسے لورچہاں سے مخاطب ہو کر کہتا۔ ”ظالم ہر بار کہتی ہے سیال کوٹ کے لڑکے، سیال کوٹ کے لڑکے، کبھی اس کی جگہ لائیں پورے لڑکے تو کہا کر۔۔۔“

لوز جہاں نے تو گوپال کی بات کبھی نہیں سنی۔ مگر کانج کے لڑکوں نے ضرور گانا شروع کر دیا۔ ”اومنڈا لائل پوریا۔“

بھنے ہوئے پھنے بیچنے والا کہتا ”بمیں کا با بومیرا چنانے لگیا“ تو گوپال ہنستا۔ ”چنانے لگیا تو ایسے کہتا ہے جیسے اس کی رٹکی بھونگ کرنے لگیا ہے۔“ عینکوں والی لڑکیاں گوپال کو لڑکیاں نہیں لگتی تھیں۔ ”جب بھی آنکھوں کو دیکھنا ہو پہلے شیشے کی دیوار پار کرنی پڑتی ہے۔“ گوپال کہتا اور ان لڑکیوں کو لڑکیوں کی فہرست میں سے ہی نکال دیتا۔ کسی لڑکی نے اونچی سارٹھی باندھی ہوتی، پاؤں میں موزے پہنے ہوئے ہوتے، ہاتھ میں چھتری پکڑتی ہوتی تو گوپال ہنسکر منہ پھر لیتا ”و یہ لڑکی تھوڑی ہے۔ یہ تو ما سٹرنی ہے ما سٹرنی۔ جو طالب علم حساب میں کمزور ہو وہ ما سٹرنی سے شادی کر لے۔“

کوئی لڑکی گہرے رنگوں کے کپڑے پہنے ہوتی یا بانہوں میں چوریا ہی بہت زیادہ ہوتیں تو گوپال کہتا ”و یہ تو رنگوں کا اشتہار ہے۔ لڑکی تو دکھانی دیتی ہی نہیں، لیس پوری کی پوری چوریوں کی دوکان ہے۔“

کسی کی بارات جارہی ہوتی تو اسے دیکھ کر گوپال اُراس ہو جاتا چچ... چچ... پچچ... پچچ بچارے کا دیوالہ نکل گیا۔ ”گوپال کہتا ”جب آدمی عاشق بننے سے پہلے شوہربن جاتا ہے تو سمجھو اب بچارے کے پاس صیری کی پوچھی پاکھل ختم ہو گئی۔ اور اس نے کھبر اکر دیوالیہ ہونیکی درخواست دے دی ہے۔“ ”شاید وہ اپنی محبوب سے ہی شادی کرنے جا رہا ہو۔“ گوپال کا

کوئی دوست کہتا۔

”نہیں یا رُلف کو سرکرنے میں عمر لگتی ہے۔ غالب کی ڈوم لڑکی اور لورکا کی خانہ پدوش لڑکی۔ ان کے دروازے پر کبھی بارات نہیں آتی۔“ اور گوپال سالہا سال اس زلف کی باتیں کرنا رہا جس کے سرکرنے میں اسے عمر گزارنی تھی۔

اور گوپال شبیہوں میں کھو گیا۔ کالی رات جیسے بادل، مگر اسے کسی رات نے نیند نہیں دی۔ چھنٹے جنکل جیسے بال، مگر وہ کسی جنکل میں کھونہ سکا سمندہ کی لہروں جیسے بال، مگر وہ کسی لہر میں غوطہ نہیں لگا سکا۔ اور گوپال کو عمر کے جو سال ایک زلف کو سرکرنے میں لگانے تھے، وہ زلف کو تلاش کرنے میں ہی کھوتے رہے... اور پھر گوپال اپنے سوالوں کے کھو جانے سے گھبر گیا۔

”تم بھی اب ہماری طرح دیوالیہ پن کی درخواست دے دو یا رات“ کالج کے پڑالے دوستوں میں سے جب کوئی ملتا تو گوپال سے مذاق کرتا۔ عمر کے اٹھارویں سال میں جوانی کے پاگل سُکتے نئے گوپال کی ٹانگ کو کافا تھا اور زخم پر لگانے کے لئے گوپال ایک لال مرچ جیسی لڑکی تلاش کر رہا تھا، مگر اب عمر کے تیسویں سال میں اس زخم کا زہر اس کے تمام جسم میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔

اب گوپال سوچنے لگا تھا۔ وہ نہ غالب سے نہ لورکا۔ وہ صرف گوپال ہے یا ایک ابیشور داس یا ایک شیر سنگھ یا ایک اللہڑکھا۔ اور اس نے سر نکلوں ہو کر دیوالیہ ہونے کی درخواست دے دی۔

”کیوں پا رہا۔ آج ڈوم لڑکی کے گھر بارات جائے گی یا خانہ بدشش کے گھر میں؟“

”سُنہ اُبھائی کیسی ہے؟“

”اور کچھ نہیں تو ہم تمہاری لال مرچ کے دیور تو بن رہی چاہئے گے۔“

”بیٹھ کر سولنے کی انگوٹھی کی بجائے ہیرے کی انگوٹھی ہی دینی پڑے بھائی کا گھونگھٹ ضرور اٹھائیں گے۔“

گوپال اپنے دوستوں کے مذاق کو اپنے ہاتھ پر شادی کے لال ڈرسے کی طرح باندھے جا رہا تھا اور ہستا ہوا کہتا جاتا تھا ”ماستر فی ہے ما سٹرنی۔ عینک بھی لگاتی ہے تمہاری بھائی۔“

مال نے جب رشتہ طے کیا تھا تو گوپال سے کہا تھا کہ اگر وہ چلے تو کسی بہانے وہ لڑکی کو دکھا دے گی۔ مگر گوپال نے خود ہی انکار کر دیا تھا۔

”جب دیوالی ہی ہونے کی عرضی دینی ہے تو...“

ڈولی دروازہ پر آگئی۔

”خوبصورت ہے بہو۔ گھر کا سنگار ہے۔“ اسے مونہہ دکھائی کے روپے دیتے وقت گوپال کی طافی کہہ رہی تھی۔

اور گوپال سوچ رہا تھا۔ جب لوگ دروازے کے سامنے کوئی نہیں لا کر باندھتے ہیں تب بھی یہی بات کہتے ہیں۔ ”بھینس تو گھر کا سنگار ہوتی ہے۔“ اور جب لوگ ڈولی لیکر آتے ہیں تب بھی یہی بات کہتے ہیں ”بہو تو

محھر کا سندگار ہوتی ہے، اور پھر بھینیں اور ہوئیں جو فرق ہوا وہ کہاں گیا؟ اور پھر گوپال خود ہی نہ دیتا۔ یہ بھی وہی فرق ہے جو ایک عاشق اور ایک دُلھا میں ہوتا ہے،“

گوپال کی بیوی نہ اتنی خوبصورت تھی اور نہ ہی اتنی بد صورت۔ عام طور سے جیسی لڑکیاں ہوا کرتی ہیں۔ دیکھنے میں بس سٹھیک ہی لگتی تھی۔ اور گوپال کو نہ کوئی چاہتا تھا کوئی شکایت۔ وہ قسم قسم کی پوشانک پہنچی مگر گوپال اُسے کبھی درنگوں کا اشتہار نہ کہتا تھا اور وہ سہاگ کی چوڑیاں اور جھینز کے کڑے سب کچھ ایک ساتھ پہن لیتی۔ گوپال اُسے کبھی ”وزیورات کی دوکان“ کا لعنہ نہ دیتا۔

آج کل گوپال کو جوانی کے شروعِ دلوں میں پڑھا ہوا ایک انگریزی نادل یاد آیا کرتا تھا۔ جس میں اپنے خوابوں کی راکی تلاش کرنے کے لئے شاعر عمر لگا دیتا ہے۔ مگر اسے تلاش نہیں کر سکتا۔ اور پھر مرتے وقت اپنے بیٹے کو اپنے تمام تصور اور اپنی تمام لگن دیکر وصیت کر جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی آنکھوں والی، اس قسم کے ناک نقشے والی، اور اس قسم کے بالوں والی راکی کو ضرور تلاش کرے، اور تمام عمر تلاش کرنے کے بعد اُس کا بیٹا مرتے وقت یہی بات اپنے بیٹے کو وصیت کر جاتا ہے۔

”وُرْلَفْ کو سر کرنے میں غالب نے توصیر ایک ہی عمر کا اندازہ لگایا تھا“ مگر گوپال سوچتا، زندگی کی شرکست، غالب کے اندازہ سے بہت بڑی ہے۔ اور آج کل گوپال سوچ رہا تھا، اُس کے گھر ایک لڑکا پیدا ہو گا مگر ہو

اُس کی شکل ہو بہاؤس کا دل ۔ ہو بہاؤس کے پسند۔ اور پھر اُس کا لڑکا جوان ہو گا وہ ایک لال مرچ جیسی لڑکی ضرور تلاش کرے گا۔ اور پھر وہ تمام دنیا کو اپنے بیٹے کی آنکھوں سے دیکھے گا۔

”آج میں برف والا پانی نہیں پوئی گی“، ایک روز گوپال کی بہون نے شکنجه بین کا گلاس اپنی ساس کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ اور ماں جب اُس کے لئے چائے بنانے رسونی گھر میں گئی تو گوپال نے اپنی بہو سے ہلکا سامنا ذاق کیا ”میں تمام ہمیں پسند جمع کرتا ہوں۔ اور تم ہمیں کے آخر میں سارے پسند توڑ دیتی ہو۔“

شاید انہیں الفاظ کا اثر تھا کہ اگلے ہمیں گوپال کی بہو کو دین لگ گئے اور گوپال کی بہو میں جیسے ابھی سے اُس کا بیٹا کھیلنے لگا۔

”دکھٹی یا نمکین چیز تو کبھی مانگتی ہی نہیں بیچتی“ کا دل دیکھتی چیزوں کے لئے مچلتا ہے ضرور بیٹا ہو گا۔ تمہارے پیدا ہونے کے وقت مجھے بھی گھر کی کھیراچھی لگتی تھی“ ماں جب کہتی گوپال کو لگتا اب تو اس کا بیٹا توٹی باتیں بھی کرنے لگ گیا ہے۔

یہ نو ہمیں گوپال کو سچپے نوسال کی طرح معلوم ہے۔ اور پھر گھر میں لگ گوا اور اجوان اکھٹی ہونے لگی۔

کمرے کا دروازہ بند کیا ہوا تھا۔ گوپال نے باہر برآمدے میں بیٹھ کر کاغذ قلم اور ایک کتاب اپنے سامنے اس طرح رکھی ہوئی تھی جس سے دیکھنے والے

کو لگے گویا اسے سراٹھانے کی فرصت نہیں تھی مگر گوپال کتاب کا کبھی کوئی ورق اللہنا کبھی کوئی۔ اور پھر جو صفحہ سامنے آ جاتا اُس کو ہی کاغذ پر نقل کرنے لگتا۔

دروازے کے پاس وہ جم کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اُس کے کان اندر کی آواز سُسنے کے لئے کھڑے تھے اور گوپال انتظار کر رہا تھا۔ ابھی ابھی دای کہے گی ”لاکھ لاکھ مبارکبادیاں، گوپال کی ماں... یہ لو بیٹا۔“

ایک مرتبہ دای باہر آئی بھی تھی۔ کہنے لگی ”بیٹا گوپال۔ ذرا جا کر تھوڑا سا شہد تو لادے۔ دیکھ کر لانا۔ شہد نیا ہو۔“

گوپال دہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا کیا پتہ اُس کے پیچھے... جلدی ہی کچھ ہو جائے... میں اُس کی پہلی آواز سُنوں گا۔ یہ سوچ کر اُس نے دای کو ڈانٹا۔ ”شہد کی پاداب تمہیں آئی ہے۔ یہ تمام کام پڑا ہوا ہے میرے سامنے۔ کل مجھے یہ کام ذفتر میں دینا ہے۔“

”تم مردوں کو تو اپنے کام کی ہی ٹری نہیں ہے۔ آخر بُوھی عمر ہے کبھی باتیں بھول جاتی ہوں۔“

دای یہ کہہ ہی رہی تھی کہ گوپال کی ماں نے مشکل حل کر دی۔ کہنے لگی — ”ہمارے یہاں کبھی کسی نے شہد وہ نہیں دیا۔ ہم تو انگلی پر تھوڑا سا گڑ لگا کر مونہہ میں ڈال دیتے ہیں۔“

”اچھا گڑ ہی سہی۔“ اور دای اندر چل گئی تھی۔

گوپال کے کان پھر دروازے کی طرف لگے ہوئے تھے۔ اور اچانک بچے کی روئے کی آواز آئی۔ گوپال کا سائنس جیسے کسی نے ہاتھ میں پکڑ لیا ہو۔ وہ نیچے

آرٹھا اور نہ اپر جا رہا تھا۔ اور ابھی تک دائی کی آواز نہیں آئی تھی۔ اُسے بچے کی آواز کی نسبت دائی کی آواز کا زیادہ انتظار تھا۔

اور پھر دائی کی آواز آئی ”ولڑکی“

گوپال کی کرسی کا نپ گئی۔ اُس کی ماں شاید پانی یا نولیہ لینے باہر آئی ہوئی تھی۔ گوپال کے ہونٹ کا پنے ”ماں ولڑکی“

”دنہیں بیٹا نہیں، تو بھی پاگل ہے۔ دایاں یہی کہتی ہیں۔ اگر کہہ دیں کہ بیٹا ہوا ہے تو زیادہ خوشی کی وجہ سے بہو کی جان کا خطرہ ہے۔“ اور جلدی جلدی اندر چل گئی۔ گوپال کی کرسی اپ پہلے کی نسبت اتنی نہیں کا نپ رہی تھی۔ مگر پھر بھی گوپال نے اُسے دیوار کے سہارے لگا دیا تھا۔ ”بیٹی ہو یا بیٹا۔ جو بھی ہو قسمت والا ہو۔“ دائی کی آواز آئی۔

”بیٹی تو لکشمی ہوتی ہے۔ اس مرتبہ بیٹی تو دوسرے سال بیٹا۔“

ماں دائی سے کہہ رہی تھی۔

”ولڑکی ہے کہ رشتم کا دھاگا ہے....“ ماں کہہ رہی تھی یا دائی کہہ رہی تھی۔ اس مرتبہ گوپال سے آواز نہیں پہچانی گئی۔ اُس کی کرسی کا نپ اور کرسی کی وجہ سے ساری دیوار ہل گئی۔ اُسے محسوس ہوا وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ لالہ گوپال داس اور اس کی بیوی اپنے گھٹنوں کو دباتی ہوئی کہہ رہی تھی ”ولڑکی اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ کوئی لڑکا دیکھونا۔ کہاں چھپاؤں اس آنچل کی آگ کو؟ ایسا روپ... اور سے زمانہ برہے“

اور پھر جیسے اُس کے دروازے پر بارات آگئی۔ اُس کے داماد

لے اُس کے پاؤں چھوٹے۔ اُس کی بیٹی لال کپڑوں میں پیٹی ہوئی نہیں۔
وہ ڈولی کے پاس جا کر اسے دلا سہ دینے لگا... اُس کی بیٹی...
بالکل لال مرچ ...

لال مرچ ... لڑکی ... لال مرچ ... اور گوپال کو
محسوس ہوا آج ... آج کسی نے مرچیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں
چھوٹکے دی تھیں۔

تجارت کا سوال

بندو کی ماں اپنے پیار کی شدت کو ظاہر کرنے کے لئے ہمیشہ اُسے ”بندی“ کے نام سے پکار کرتی تھی۔ بندو کے ماتھے پراؤس کے مراٹھے ہوئے بال ایک جھال کی شکل میں ہوتے رہتے تھے۔ اور اُس کی موٹی موٹی آنکھوں پر ملکوں کے لمبے لمبے پال چھوٹی چھوٹی جھالیں بن جایا کرتے تھے۔ ان سیاہ جھالوں میں اُس کا گورا چڑانگ اور بھی کھل اٹھتا تھا اور ہنڑوں کا سُرخ رنگ اور گہرا سُرخ دکھانی دینے لگتا تھا۔

بندو کی ہم جماعت لڑکیاں ابھی جمع تفرقی کے سوالوں تک ہی پہنچی تھیں کہ وہ ضرب کے سوال حل کرنے لگی۔ اگلی جماعت میں پہنچ کر چب وہ ضرب کے سوال حل کرنے لگیں تو بندو تقیم کے سوالوں کی مشکل ترزو میں سے گزر رہی تھی۔ اور پھر جب ان کے ناپختہ ذہن تقیم کے سوالوں کے ساتھ

زور آزمائی کرنے لگے تو بندوبٹوں کے سوالوں میں ہمارتے حاصل کر جکی تھی۔ اپنی محنت اور قابلیت کی وجہ سے وہ ہر جماعت میں اُستانیوں کی منظور نظر بنی رہی تھی اور محبت کے چند بے کے تحت اُستانیاں بھی اُسے ”بندو“ کی بجائے ”بندی“ کے نام سے پکارنے لگی تھیں۔

سُریندر بندو کے مکان کے بالکل سامنے والے مکان میں رہا کرتا تھا۔ عمر میں وہ بندو سے تین چار سال بڑا تھا دلوں گھروں میں کوئی خاص راہ و ربط نہ تھا۔ معمولی پڑوسیوں کے سے تعلقات تھے۔ ایک دن سُریندر کی والدہ اُس کی ماں کے ساتھ با تین کرتے کرتے ایک دم بندو سے کہنے لگی

”بیٹی تم ہمارے ہاں کبھی نہیں آتیں کبھی کوئی سوال وغیرہ سمجھنا ہو تو ہمارے ”بندی“ سے پوچھو لیا کرو۔ ہمارا سندی حساب میں بہت ہوشیار ہے۔“

سُریندر کی والدہ کی یہ بات بندو کے دل میں گھر کر گئی۔ وہ اپنے مکان کی کھڑکی میں سنتے بھلی کی روشنی میں بیٹھے ہوئے سُریندر کو دیکھتی ہی تی پار بار اُس کے ذہن میں یہ خیال ابھرتا۔

”کاش بٹوں کا یہ سوال غلط ہو چاہے تاکہ میں اپنی کاپی لے کر سُریندر سے اس کا صحیح حل سمجھنے جاسکوں۔“

بندو اپنے سوال انتہائی لاپرواہی سے حل کرتی۔ اس غفلت کے باوجودِ حجج وہ اپنا جواب حساب کی کتاب کے جواب کے ساتھ ملا تی تو ہر

مرتبہ اس کا جواب صحیح نکلتا۔ جب تھا ہٹ میں وہ کاپی اور پنسل میز پر ٹھیک دیتی۔ وقت گزرتا گیا۔ تھی کبھی بندوں کے سوا لوں کے جواب غلط ہوتے اور تھی وہ اپنی کاپی سُرپندر کے سامنے رکھ سکی۔ ایک روز اس نے مُنا کہ سُرپندر کی ٹانگ میں کھیلتے کھیلتے چوٹ آئی ہے۔ سُرپندر کی ٹانگ سے لگا تار خون بہے چار ہاتھا۔ صبح سے دو ڈاکٹر سُرپندر کی ٹانگ کا معافہ کر چکے تھے بندوں کی والدہ بھی سُرپندر کے گھر مزاج پرسی کے لئے ہو آئی تھی۔ بندو چاہتی تھی کہ وہ بھی جا کر ایک نظر سُرپندر کو دیکھ آئے۔ لیکن اُس کی والدہ نے اُس سے ساتھ چلنے کے لئے پوچھا تک نہیں۔ اگلے روز اس سے پہنچا کہ سُرپندر کی ٹانگ میں شیشہ کا انکڑا چھوڑ گیا ہے۔ اُس نے تکلوانے کے لئے سُرپندر کو ہسپتال میں داخل کرانا ہو گا۔ ”چاند ایسا خوبصورت لڑکا ہے۔ ایشور کرے اُس کے جسم میں کوئی بھی آئے۔“ ایک سو ہفتہ تک بندو کے گھر اور ٹرپس میں ایسی بائیں ہوتی رہیں۔

اور پھر سُرپندر ہسپتال سے واپس گھر آگیا۔ بندو اپنے مکان کی کھڑکی میں سے پھر اس سے دیکھنے لگی۔ کبھی سُرپندر کی ماں اُس سے دوائی پلاتی ہوئی نظر آتی۔ کبھی رو دھ۔ اور بھی آہستہ آہستہ سُرپندر کی ٹانگ کی ماش کرنی دکھانی دیتی سُرپندر سارا دن ساری رات مکبل اور حصے چار پانی پر لیمارتہا۔

چھوڑنے کے بعد سُرپندر کی پئی کھول دی گئی۔ اب وہ بستر سے اٹھ کر کھرے میں ادھر ادھر تھوڑا بہت گھومنے بھی لگ گیا تھا۔ بندو نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ سُرپندر کی بائیں ٹانگ قدر سے لنگڑاتی ہے۔ اس حالت میں اُس کے لئے سکول جانا ممکن نہ تھا۔ ماسٹر گھر پر اگر سے پڑھانے لگا۔ لگا تار

کئی کئی گھنٹے وہ اپنے لپتھر میں لیٹا ہوا پڑھتا رہتا تھا پندو نے سنا کہ سُریندر کی ٹانگ کی بھی فی الحال کئی سال تک دور نہ ہوگی جوں جوں جسم میں طاقت بھرتی جائیگی، اس کی ٹانگ ٹھیک ہوتی جائے گی۔

بندو سکول میں اب تجارت کے سوال کر رہی تھی پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا اسے، اتنا ہمیشہ کو شدش اور پوری توجہ کے باوجود اس کے ہر سوال کا جواب غلط ہو جاتا تھا۔ وہ دوسری بار کوشش کرتی۔ مگر پھر بھی صحیح جواب نہ آتا۔ آخر ایک دن اس نے اپنی ماں سے پوچھا ہی لیا ”ماتا جی اگر آپ کہیں تو میں سُریندر سے سوال سمجھو آیا کروں۔“

سُریندر کا سکول جانا، کھیلنا کوڈنا، غرضیکہ ہر قسم کی مصروفیات بندھیں لپتھر میں لیٹ کر متواتر کئی کئی گھنٹے پڑھتے رہنا اس کا واحد شغل رہ گیا تھا۔ بندو کا اس کے پاس سوال سمجھنے کے لئے آنا سُریندر کی خدو زندگی میں ایک نئی وسعت پیدا کرنے کا متراد ہے تھا۔

بندو اس وقت کا انتظار نہیں کرتے تاکہ سے کرتی جب وہ سُریندر کے پاس پڑھنے جاتی تھی، سُریندر بھی سارا دن اس کی راہ نکلتا رہتا تھا۔ عمر دل میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے انتظار میں بھی اضافہ ہونا گیا۔

بندو کی پیشانی سے اپنے بچپن کی بادگاری اشیدہ بالوں کی جھال را ترچھی تھی۔ اس کے بال اپ کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کا لی جھال کی جگہ اس کے ماتھے پر جوانی کے جذبات کی لشکری جھال لہرائھی تھی جوانی

لے اُس کے حسن میں بیار نگ بھرنا شروع کر دیا تھا۔ ماں اب بھی پیار سے اُسے ”پندی“ کہہ کر لپکار کرتی تھی۔ سکول کی استانیاں بھی ابھی تک اس پیار بھرے نام ہی سے اُسے بلا تین لیکن پتہ نہیں سُریندرا کے ہونٹ اس سادہ سے لفظ میں کہاں سے اتنی میٹھاں بھروسیتے تھے۔ جب پندو اُس کے منہ سے ”پندی“ کا لفظ سُستی تو اُسے اپنی روح میں ایک شہد سا گھلتا محسوس ہوتا۔

پیار کے اس خوشگوار اور میٹھے ماحول میں دُوبے ہوئے سُریندرا اور پندو نے مُسا کہ پندو کی شادی ہونے والی ہے پندو کے ماں باپ نے اُس کے لئے ایک نہایت لائق اور خوبصورت دُواہ پسند کیا تھا۔ یہ خبر سن کر سُریندرا نے اپنی آنکھوں سے پہرہ رہے آنسوؤں کی پرواہ کرتے ہوئے پندو کے آنسو اپنے ہونٹوں سے چوم کر کھا۔ ”پندی جاؤ۔ آخر میرے پاس تھیں خوش رکھتے کے لئے رکھا ہی کیا ہے۔ میں ایک اپا رج ہوں میری یہ لوٹی ہوئی طانگ شاہزاد بھی بھی طھیک نہ ہوگی۔ مجھ سے تو اپنا بوجھ بھی نہیں اٹھایا جا رہا۔ تمہارا بوجھ کیسے برداشت کر سکتا ہوں میرے جیسا اپا رج تھیں کیا کھلائے گا۔ میری خواہش یہ ہے کہم شادی کرو۔ اور اپنی زندگی آرام اور چین سے گزارو۔“

ہچکیوں اور آنسوؤں کے ہجوم میں گھری ہوئی پندو کے گلے سو بمشکل تمام یہ الفاظ لٹک لٹک کر نکلے ”سندی... نہیں نہیں... سندی۔ مجھے یہ تجارت کا سوال نہیں آتا... نہیں آتا۔“

بندو کی بارات آگئی۔ مگر بندو اور سریندر دلوں غائب تھے۔
شادی کے گیت گارہی ڈھولک ایک دم پھٹ گئی۔ حلوا بیوں کی بھیوں
پر یاس کا پانی پھر گیا اور بندو کی ماں کا آنچل اُس کے آنسوؤں کی آگ
بیس جل اٹھا۔

۲

بندو ماں بننے والی تھی سریندر شہر میں ایک صابن بنائیوں کے
کارخانے میں ملازم تھا۔ انہوں نے ایک تنگ و تاریک مکان کرائے
پر لے رکھا تھا، مگر بندو کے حسن کی تاپانی اور فراخ دلی نے اُس مکان
کو لاحدہ و دوست اور بے پناہ اجala بخش دیا تھا۔

کبھی کبھی بندو سریندر سے محبت بھرا اصرار کرتی ہوئی کہتی۔

”میرے ساتھ چار پھرے تو لے لو۔ میرے ماتھے پر اپنے ہاتھوں
سے سہاگ کی بندی تو لگا دو۔ نہیں تو یہ لوگ مجھے رکھیل کہیں گے،
کوئی بھی مجھے تمہاری بیوی ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔۔۔ اور اب ۔۔۔
اب تو ۔۔۔“

سریندر اس آدھی بات کا مطلب خوب سمجھتا تھا، جو بندو کے
جسم میں روز بروز بھرتا جا رہا تھا۔ ساری بات کو سمجھتے ہوئے بھی نہ جانتے
کیوں وہ بندو کے سوال کو ہر بار ڈال جاتا تھا۔ اپنے دل کی ڈھاریں بندھاتے
کے لئے بندو خود ہی کہتی

”اچھا سندی.... اپنی پیشانی بھی میں خود ہی ہوں اور اپنی بندی بھی.... جیسے تم خوش ہو سکتے ہو اسی میں میری خوشی ہے۔“
 پھر ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی۔ سُریندر نے ایک گھلہ ہوادار مکان کرایہ پر لے لیا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی گھر میلو ضرورت کی چیز گھر آلنے لگی۔ بازار میں چیزوں کی قیمتیں ناقابل برداشت حد تک چڑھی ہوئی تھیں۔ اور ہر روز چڑھو رہی تھیں۔ پھر بھی وہ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی چیز خرید لانا تھا۔ بندوں حیران تھی۔ جب بھی اُس نے سُریندر سے اس معاملے میں پات کی تو وہ ہمیشہ ہنس کر کہا کرتا تھا۔

”میرے کام اور ایمانداری سے خوش ہو کر سبیٹھو لے میری تتوخاہ بڑھادی ہے۔ تتوخاہ کے علاوہ کارخانے میں میرا حصہ بھی ہے۔ اب سب لوگ مجھے ”چھوٹے شاہ جی“ کے نام سے پکارتے ہیں۔“
 بندو یہ جواب مُسن کر خوش ہو جاتی اور سوچتی دو کیا واقعی ہماری قسمت پلت پھکی ہے۔“

مگر بندو کو یہ حیران تھی کہ جب اُس نے اپنا دل کھو لکر سُریندر سے محبت کی ہے تو پھر اُس کے دل میں گھبراہٹ سی کیوں پیدا ہو رہی تھی۔ سُریندر پہلے بڑی نرم نرم باتیں کیا کرتا تھا۔ اب ان باتوں میں ایک تنوادہ سائیوں محسوس ہو رہا تھا۔

بندو کے ہال لٹکا پیدا ہوا۔ اُس کی شکل ہو یہو سُریندر سے ملتی تھی۔ بچے کو دیکھ دیکھ کر بندو سوچا کرتی ”اپنی شکل کی سب دل فرسی،“

سب خوبصورتی اپنے بیٹے کو سونپ کر خود مجھ سے پرے ہستے جا رہے ہو، ”دل کے دامن کو دہ جس قدر ضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تنامنے کی کوشش کرتی، اتنی ہی تیزی سے وہ اُس سے چھوٹتا جا رہا تھا۔

بچے کا نام رکھنے کی رسم سرپردار نے خوب دھوم دھام سے منانی ایک نہایت ہی پرستکلف اور سچ پہلانے کی دعوت دی گئی جس میں اُس کے کارخانے کے سب ساتھی اور دیگر بہت سے احباب نے شرکت کی۔ اس موقع پر لکھنو کی ایک مشہور گانے والی طوالہ بھی بلائی گئی بندولتے کہیں سے یہ سن رکھا تھا کہ سرپردار ان دلوں شہر کی ایک گانے والی کے کوئھے پر اکثر آتا جاتا ہے۔ بندوں کے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ ہونہ ہو یہ گانے والی لکھنو کی نہیں بلکہ وہی طوالہ ہے۔ اور یہ دعوت کا سارا اڈ مبر صرف اُسے گھر پر بلانے کے لئے رچا گیا ہے۔ بندولتے اپنے اس شبہ کو ظاہر کیا۔

تین گھنٹے مردانہ میں صہالوں اور صاحبِ خانہ کی طبیعت خوش کرنے کے بعد جب گانے والی جانے لگی تو گھر کی مالکہ کو، سرپردار کے بیٹے کی ماں کو سلام کرنے کے لئے بندوں کے پاس آئی۔ بندولتے بڑے میں سے پچاس روپے لیکال کر اسے بطور العام دینا چاہے۔ وہ روپے لوٹاتی ہوئی کہنے لگی۔

”و آپ کیوں خواہ نخواہ تکلیف فرمائی ہیں۔ اس گھر کا دیوالو میں روزہی کھاتی ہوں۔ شاہجی ہر روز کچھ نہ کچھ دے رہی آتے ہیں؟“

گانے والی کے یہ الفاظ بندوں کے احساس خود داری پر سچر کی طرح

پڑے، اور وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی ”تو جو افواہیں میں نے سُنی تھیں
وہ پچھئیں... یہ دعوت میرے بچے کی خوشی میں نہیں... یہ
صرف اُس...“ مگر بند و اپنے دل کی ٹیکس کو دبکر اور اپنا سر بلند کر کے
کہنے لگ۔

”وہ کوئی لوہنے، شاہ جی تو تمہیں ہر روز روپے دینے رہتے ہیں،
مگر میرے ہاتھوں سے کب کب ملیں گے۔“ اور پھر اُس نے لوت رہی کاغذوں
کی طرح مسل کر گانے والی کے دامن میں پھینک دئے۔

چھان رخصت ہو گئے سُر بند در اندر آیا بندوں کے ضبط کا باندھٹ
گیا۔ اس کی گود میں سر کھکھل کر اُس نے روٹے ہوئے پوچھا ”سندی میرے
سندی۔ تم میرے ساتھ یہ کیا کر رہے ہو؟“

”وہ آخر تمہیں کس بات کی کمی ہے۔ تمام گھر تمہارا ہے۔ تم ایک سٹے
کی ماں ہو۔ دنیا کے تمام سکھوں میں تمہارے قدموں میں لاکڑاں دیتا ہوں۔
تمہیں اور کیا چاہیے؟“

سُر بند رئے خالص تاجراہ لمحے میں اُس کے آنسوؤں کا جواب دیا۔
بندوں کے آنسوؤں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

تمہیں کھوکران دنیاوی سکھوں کا میں کیا کروں گی۔ بندی تم
جانتے ہو کہ تجارت کا سوال میں کبھی عصیک حل نہیں کر سکی۔ یہ مجھے نہیں
آتا... نہیں آتا۔“

چند ماہ بعد کارخانے کے ایک آدمی نے بندو کو آکر بتایا کہ سیدھے نے
سیندرو غبن کے الزام میں گرفتار کر دیا ہے۔ پچھلے کافی عرصہ سے سیاہ بختی
کے جو کالے سائے بندو کے گورے چہرے پر اپنی پرچھائیاں دال رہے تھے۔ آج
وہ اُسے چیل کی طرح جھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ ان پرچھائیوں سے
ڈر رہی تھی۔ لیکن اس اچانک حملے نے اس کی فطری کمزوری کو غصتے میں
تبديل کر دیا۔ وہ سیاہ بختی کے ان کالے پروں کو اپنے دلوں ہاتھوں سے مر ڈر
کر ان کی قوت پرواز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتی تھی۔ اسی جوش کی
حالت میں وہ کارخانے کے مالک سیدھے کے پاس جا پہنچی۔ اور اس سے
سُر سیندرو سے ملنے کی درخواست کی۔ سیدھے نے پولیس سے کہہ کر سُر سیندرو سے
اُس کی ملاقات کا انتظام کر دیا۔

بندو چانتی تھی سُر سیندرو گناہ کا رہے۔ اُس نے غبن کیا ہے۔ مگر پھر بھی
نہ چانے کیوں وہ ایک بار اُس کے مو نہیں سے اس کا اقبال جرم سننا چاہتی
تھی۔ سُر سیندرو کی حالت پر کئے پرندے کی طرح تھی۔ ندامت کے احساس نے
اُسے گردن جھکلاتے پر مجور کیا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے تمام گناہوں کا اعتراف
کر لیا۔ اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی گردن اٹھا کر کہنے لگا۔

”بندی میرا خیال چھوڑو۔ میں اپنا انجام جانتا ہوں۔ جاؤ۔۔۔
جس قدر پہم اپنے ساتھ لے جاسکتی ہو لے جاؤ۔۔۔ دُور پہاں سے
بہت دور۔۔۔ مجھے اپنی موت مرنے دو۔۔۔“

بندو کے دل میں جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ وہ سُرپندر سے بہت پچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس نے کچھ نہ کہا۔ حوالات سے اٹھ کر سیدھی وہ کارخانے میں آئی اور سیدھجی کے پاؤں پر سرکھ کر وہی ہونے کہنے لگی۔
وہ سیدھجی اپنا تھام روپیہ واپس لے لو۔ میرے بھرے گھر میں تالالگادو میں انہی تین کپڑوں میں شہر سے لکھ جاؤں گی۔ مگر ایشور کے لئے میرے سُرپندر کو رہائی دلوادو... کسی طرح اُسے چھڑا دو... مجھ پرنس کھاؤ سیدھجی... ”

سیدھ کی مکروہ ہنسی نے بندو کے دماغ کو مأوفت کر دیا۔ اُس کے ماتھے پر سینے کے موڑے طموٹے قطرے سے نمودار ہوئے اور اُس کا سارا جسم لرز لے لگا۔ ... کمرہ گھوم گیا۔ ... اور ... اور پھر اُس سے کچھ نیچہ نہ رہا کہ وہ کہا ہے ... ”

جب اُسے ہوش آیا تو اُسے محسوس ہوا جیسے کہہ میں شراب کی اہریں اُبھر رہی ہوں، جن میں وہ دُوبی جا رہی تھی۔ پاس ہی کھڑا ہوا سیدھ اُسے ایک بھیانک کالا دیوگ رہا تھا۔ مگر اُس کا لے دیو نے اس کے سُرپندر کو اپنی قید سے رہا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ بندی اس وعدے پر اپنی تھام زندگی سچھا کر لئے کو آمادہ تھی۔ اُس نے شراب کی بڑھتی ہوئی لہروں اور سیدھ کے بڑھتے ہوئے بازوؤں میں اپنے آپکو غرق ہو جانے دیا۔

رات اپنی گردن جھکائے، اپنے چہرے پر سیاہ مانگی نقاب اور چلی گئی۔ دین کی سفید روشنی میں بندو نے دیکھا کہ سُرپندر حوالات سے چھوٹ کرے

اُس کے پاس آگیا ہے۔ اور اُس کے بُخار کی گرمی میں جلتے ہوئے مانچے پر برف کی
پیٹاں رکھ رہا ہے۔

سیدھے نے سُریندر کے خلاف غبن کا مقدمہ واپس لے لیا بندو کے
جسم کے علاوہ ان کے گھر کا کل سامان اور سُریندر کی لفکری بھی سیدھے نے اپنے
ہر جانے کے طور پر ان سے وصول کر لی سُریندر اور بندو وہ شہر حضور کردہ سے
شہر میں جا لیے مگر بندو کے مقدر کی تاریکی وقت کے ساتھ ساتھ کم ہونے کی
بجائے اور گہری ہوتی گئی سُریندر اُس کے نام ایک خط لکھ کر خود نہ جانے کہاں
چلا گیا۔ خط میں لکھا تھا۔

”و تم اگر اپنے لئے نہیں تو کم از کم اس معصوم اور خوبصورت بچے کی
جان بچانے کے لئے ہی واپس اپنے ماں باپ کا دروازہ کھلکھلاؤ۔ میں
کسی اور شہر میں قسمت آزمائے جا رہا ہوں۔ اگر زندہ رہا تو ضرور واپس
آؤں گا۔ اب ... پچھے نہیں کہہ سکتا۔“

پھر خط پڑھ کر بندو نے اپنے دل کے آئینے میں جھاکنا۔ وہ جیران تھی
کہ سُریندر کی شخصیت کا وہ کون سادھاگا تھا جسے تھامتے ہوئے اُس نے ماں
باپ سے، ساری دنیا سے اپنا رشته منقطع کر لیا تھا۔ اب اس موہوم
سے دھاگے کے ٹوٹ جانے پر وہ کس مونہہ سے واپس ان کے پاس جا
سکتی ہے۔ لیکن پھر اسے اپنے بچے کی بھولی بھالی شکل میں اس کا ایک نیا
دولہا نظر آیا۔ اپنی محبت کے ٹوٹے ہوئے دھاگے کی اُس نے اُس نے

دھاگے کے ساتھ گرہ لگائی۔ اور اس گرہ شدہ دھاگے میں بندھی ہوئی وہ ماں باپ کے دروازے تک پہنچ گئی۔

ماں کے جسم میں سُلگ رہی انتہا پول سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ بندو کو اپنی رُوح کی تمام تر جلن اور کوفت کے ساتھ کوس بھی نہ پائی تھی کہ بندو کی زندگی میں اماوس کی رات سے بھی زیادہ سیاہ دن آگیا۔ اس کا بچہ بیمار ہو گیا بندو کے غم و اندوه میں ڈوبے ہوئے سینے کا دودھ بچے کے نازک جسم میں داخل ہوتا رہتا۔ ایسے زہر میں دودھ کو پی کر بچے کا ندرست رہتا ناممکن تھا۔ اور آخراں کلی لئے بھول بننے سے بہت عرصہ پہلے ہی ہسپتال میں سسک سسک کر اپنی جان دے دی۔

بچے کی موت کے بعد، اس بچے کی موت کے بعد جس کی شکل میں سُرپندر اپنے بچپن کی تمام معصومیت اور خوبصورتی کے ساتھ سوچو دنھا بندو کے لئے زندگی میں کوئی لمحپی باقی نہ رہی۔ مگر موت بھی نواتی ہی بے مقصد تھی جتنی زندگی۔ اس تیرہ دنار دوارا ہے پر کھڑی بندو نے زندگی کا ایک پیسراستہ دیکھا۔ ہسپتال میں اس کے بچے جیسے دوسرے بچے بھی تھے جو اپنے نازک نازک اعضاء کے ساتھ موت کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے۔ بندو کو ان میں اپنے بچے کی شکل نظر آنے لگی۔ وہ دیوانیوں کی طرح ان کے چہروں کو سختی رہی اور پھر حندر و زل بعد بندو اپنے سیاہ مقدار کو نرس کے سفید لباس کے ذریعے چمکانے کی کوشش کرتی ہوئی دکھائی دی۔

سُرپندر کے ساتھ بھاگتے ہوئے پندو نے اپنے ماں باپ کا گھر

رات کے اندر چھیرے میں، چھپ کر، چوری چھوڑا تھا۔ مگر زس کا سفید
لباس زیب تن کرنے کے لئے اندر چھیرے میں چوری سے بھاگنے کی ضرورت نہ
تھی۔ ہسپتال کی میٹن نے اُسے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ اور اُس نے اپنے
دلن، اپنی نیندیں، اپنی راتیں، اپنے خواب سب کچھ مرضیوں کو سونپ دیا۔
ہمارا گزر لئے گئے پندو کے لئے زندگی کا مقصد ایک مرتبہ ختم ہو چکا
تھا لیکن جب وہ دوسروں کے لئے جیتنے کے راز سے واقع ہوئی تو اُس کی
زندگی دوبارہ معنی آفرین بن گئی پندو کے خلاص، محبت سے بھروسے ہوئے
روئے نے اُسے مرضیوں میں نہایت ہر دل عزیز بنادیا۔ اُسے دیکھنے میں ان
کے چہروں پر اُس اوصحت کی منور کرنیں قصہ کرنے لگتیں۔

ہاں ۰۰۰ جس روز بندو کے بھائی نے اُسے اخبار سے پڑھ کر یہ خبر سنائی کہ کان پور میں پولیس نے ایک مکان سے جعلی سکتے بنانے والا گروہ گرفتار کیا ہے۔ ان کا سر غنہ سر نیدر بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اُس دن ملٹیوں نے دیکھا کہ تھرمائیٹر کا تے وقت بندو کے ہاتھ بیدھنے کی طرح کا نپ ہے تھے۔

میٹرِن جس کی وساطت سے بندوں نے زندگی کی کھوئی ہوئی خوبصورتی
دوبارہ حاصل کی تھی۔ ایک بارہ بار، نیک پیرت با محبت میسحی خالوں تھیں بندوں
کے کانپتے ہاتھوں کو اُس نے گورے گورے نرم و نازک ہاتھوں میں لے کر
خداوند کریم سے دعا مانگی کہ وہ اپنے بیٹے کی محبت کو مذکور رکھتے ہوئے
اس دکھیاری کے دل کو سکون کامل عطا فرمائے۔ میٹرِن کے خلوص اور ایمان

پرستی نے پندو کے رحجان کو بھی خدا کی عبادت کی طرف راغب کیا۔ پندو جب ایک مریض کی چارپائی سے چل کر دوسرے کی چارپائی کی طرف جاتی تو پہلے مریض کو لوں محسوس ہوتا جیسے وہ نہ صرف بیماری اور دکھ کے کانٹے چُن کر لے گئی ہے، بلکہ صحت اور سرت کے خواص بھورتے پھول بھی بانٹ گئی ہے۔

ایک رات پندو ڈیوٹی ختم کر کے جب گھر لوٹ تو اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی اُس کے دروازے کا سہارا لئے بیٹھا ہے۔ ٹارچ جلا کر دیکھنے کے باوجود وہ اُس سے پہچاننے سے فاصلہ رہی۔ اس ڈیوٹیوں کے ڈھانچے پر کھال کی باریک سی تیہہ کے علاوہ گوشت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس نے ایک پھٹا پڑانا میلا سا کمبل اور ٹھوڑا کھاتھا۔

ٹارچ کی تیز روشنی نے اُس کی بند آنکھوں کو گھلنے پر مجبور کر دیا۔ اور ”پندی“ کہہ کر اس کے تھرکتے ہوئے ہونٹ پھر بند ہو گئے۔ ”پندی“ اس مختصر سے لفظ نے پندی کی روح کو جھنچھوڑ دala۔ یہ لفظ جیسے اُس کے کالوں میں جنم کر رہ گیا ہو۔ اس لفظ میں خدا جانے رُوحوں کی کون سی مشترک خاصیتیں ڈھلی ہوئی تھیں۔ پندو کو لوں محسوس ہوا کہ یہ شرک اس کے روئیں روئیں میں جنم گیا ہے۔ وہ جہاں کھڑی تھی، وہیں کھڑی رہ گئی۔

”پندی... پندی... پندی“ حالانکہ سُرپندر کی آنکھیں اور ہونٹ بند تھے لیکن پھر بھی اس کا کہا ہوا ایک لفظ بار بار پندو کے ذہن سے ڈکار ہاتھا۔ جس نے پندو کے اعضا میں یہ سویا ہوا اشتراک جگادیا تھا۔

وہ آواز اُس کے کانوں میں پھیلئے ہوئے یہ سے کی طرح ڈھلنے لگی پھر کسی غلبی قوت نے اُس کے مفلوج اعضا میں حرکت پیدا کی۔ اُس نے سُر بند کو سہارا دیکھا۔ کمزوری کی وجہ سے سُر بند کی ٹانگ کا نقش پھر آیا تھا سہارے کے بغیر اس کے لئے ایک قدم بھی چلنا دو جھر تھا پندوں نے اُس کا سوکھا ہوا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لیا اور دسرے ہاتھ سے اُس کی مکروہ سہارا دیکھ رکھا۔ اپنی روشنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

”لوگ کہتے ہیں اب تمہاری روح کو سکون مل گیا ہے۔ میں پھر تمہیں دکھی کرنے کے لئے آگیا ہوں۔ لیکن تم ہی بتاؤ، میں اور کہاں جاؤں۔“
اب اور کسی دروازے پر تو مجھے موت بھی نہ آئے گی بندی۔“

بندی کو یوں محسوس ہوا جیسے اُن کی دونوں کی عمروں میں ایک دم کمی واقع ہو گئی ہو۔ اُس کے سامنے سُر بند رچارپائی پر لیٹا ہوا پتدرہ برس کا لڑکا بن گیا۔ جس کی ٹانگ پر ٹپی بندھی ہوئی تھی۔ اور خود وہ بارہ برس کی ”بندی“ جو سُر بند رے کے کہہ رہی ہو

”مجھے تجارت کا سوال نہیں آتا۔“

اور پھر جب شفہ ہاتھوں سے کاپی سُر بند کے سامنے رکھنے لگی تو سُر بند نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، جیسے وہ ہمیشہ پکڑا کر رہا تھا۔

بندوں نے گھبر کر دیکھا۔ بڑے بڑے، ٹپیوں کے سے ہاتھوں نے اُس کے ہاتھ تھاٹے ہوئے نظرے۔ اور سُر بند کے ہاتھ رہا تھا

”پندی تمہارے پاس آکر میں نے ٹھیک نہیں کیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں تمہارے پاس آگیا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم سے دُور رہ کر میں مربھی تو نہیں سکتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے آنے کی وجہ سے تمہارا سب سکون، اس ب شاشتی جاتی رہے گی۔“

پندو نے سُرپندر کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”سندی تمہیں کھوکر بھلا مجھے سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ یہ سچارت کا سوال مجھے نہیں آتا ۔۔۔ مجھے کبھی نہیں آئے گا۔“

چھوٹی عمر میں پندو کے ماتھے پر تراشیدہ زلفیں ایک جھالر سی ہن کر لہراتی رہتی تھیں اور اس کا جھالر میں اُس کا گورا چٹا چہرہ اور اچھا بھر کر نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتا تھا۔ پھر جوانی نے چڑیات کی لشکمی اور رنگیں جھالر اس کے ماتھے پر لہراتی شروع کی تھی۔ اس نئی جھالر میں پندو پہلے سے کئی گنا خوبصورت نظر آئے لگی تھی۔

لیکن آج جب پندو لئے افلام، پیماری اور گناہوں کے بارے نے دلبے ہوئے سُرپندر کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھے، تو اس کی حسین و جمیل پیشانی پر شاشتی کی، سکون کی سفید کرنیں ایک نئی جھالر بن کر لہراتے لگیں۔ اس نئی جھالر والی پندو پہلی دنوں جھالروں والی پندوؤں سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔

ہڈیاں اور پھول

وہی سپھانکوٹ سے ڈالہوزی جانے والی سڑک تھی۔ وہی راج تھا اور وہی راج کی کار تھی۔ لیکن آج راج کے بائیں طرف لال جوڑا پہنچنے ہوئے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کے ساتھ پچھلے چہینے راج کی شادی ہوئی تھی اور آج سے تین برس پہلے جب راج اس راستے سے گزر اتھا، اُس کے ساتھ اُزو بیٹھی ہوئی تھی راول نے راج کے ساتھ صرف ایک دن کے لئے سفر کیا تھا۔ اور اس لال جوڑے والی نے زندگی بھر ساتھ سفر کرنا تھا۔ راج سوچ رہا تھا، کتنا اچھا ہو اگر ساری زندگی کے سفر میں وہ اس لڑکی کی زوج کی گہرا یوں میں بھی آنا ہی اتر سکے چتنا اس ایک رات میں وہ اُزو کو سمجھ سکا تھا۔ تین برس بیتے، قسمت کے ایک اشارے نے راج اور اُزو ایک

دن کے سفر کے لئے اکٹھا کر دیا تھا۔ راج اپنی گاری میں ڈلہوزی جا رہا تھا، اور پھٹانکوٹ سے گزرتے ہوئے موڑوں کے اوپرے پراؤس نے اوز کو پہچان لیا تھا۔ امرتسری سے شاید وہ ریل میں آئی تھی اور اب دوپہر کو ڈلہوزی جاتے والی آخری بس کا انتظار کر رہی تھی۔ راج نے اپنی گاری روک لی اور اوز نے ڈلہوزی تک راج کی کار میں جانا منتظر کر لیا تھا۔

اس سے پہلے راج نے اوز کو صرف ایک بار دیکھا تھا۔ کہاں تو کے ایک جلسے میں اوز گاری تھی اور راج سامعین میں بیٹھا تھا۔ پھر جلسے کے صدر نے چائے پینے وقت راج کا اوز سے تعارف کر لیا تھا۔ اس بات کو پہلے ہوئے ایک برس ہو چکا تھا لیکن ابھی تک راج کے بدن میں اوز کی یاد خلش بن کر ایک بیس پیدا کر دیتی تھی۔ راج نے اوز کو کبھی اپنی دنیا کی شے تصور نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس پورے ایک برس میں اس نے ایک دفعہ بھی اوز سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن اس خلاش کو وہ اپنی ذاتی شے سمجھتا تھا۔ اپنے لہو و گوشت میں سے طہور میں آئی ہوئی شے، اور اس لئے وہ اپنے اکیلے پن کے دلوں میں کئی مرتبہ اسے اپنے بدن میں محسوس کرتا تھا۔ اور پھر پچھلے برس اوز کے نام کو اور بھی شہرت نصیر پ ہوئی تھی، پھر جانے کے لئے جب ہندوستان کے کچھ فنکار چنے گئے تو پنجاب کی طرف سے اوز کو منتخب کیا گیا تھا۔

اوز کے پنجابی گیتوں کو چینی دو شیزادوں نے سیکھا، اور ملک کے چونی کے اخبارات نے انتہائی فخر کے ساتھ اوز کی تصاویر شائع کیں۔ اس

طرح انوکو مزید شہرت ملی تھی۔ اور راج کو اس سے ملاقات کرنے میں اور بھی رہی کچھ چاہیٹ اور جھیجھک محسوس ہولے لگی تھی۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ راج نے پھانکوٹ کے بسوں کے اڑتے پر انوکو پہچان لیا تھا۔ اور انو نے ڈلہوزی نک راج کی گاڑی میں جانا منظور کر لیا تھا۔

پھانکوٹ سے کافی میل دُور لکھ جانے کے بعد معلوم ہوا کہ چھپائیں دلوں کی لگاتار رابش کی وجہ سے اچانک آگے سڑک لوٹی ہوئی تھی اور تقریباً بیس مزدود کُدال اور بیلچے لے کر سڑک کی مرمت کے لئے جا رہے تھے۔ راج کی گاڑی کھڑی ہو گئی آنے والی شام ضرور ڈوبتے سُورج کی کہنوں سے زنگیں اور حسین ہو گئی اور پھر سر پھیل رہی رات جنگلی سپولوں کی خوشبو میں بھیگی ہوئی ہو گئی۔ لیکن وہ رات کسی چھٹت کے نیچے بسر ہوئی تھی۔ اس کا دلوں میں سے کسی کو علم نہیں تھا۔ راج نے سوچا واپس پھانکوٹ ہی لوٹ چلیں اور وہیں رات گزار دیں۔ باہم طرف پہاڑ کے قدموں میں سہی ہوئی چائے کی ایک دکان تھی۔ واپس جانے سے پہلے راج نے دوکان دار سے چائے تیار کرنے کے لئے کہا اور جتنی دیر تھیں چائے تیار ہوتی، اتنی دیر پہاڑ کے اوپر کی طرف بڑھ رہی ایک پکڑنڈی کی سمت اس نے قدم بڑھائے انو گاڑی میں بیٹھی رہی۔

انو کی بغل میں بیٹھے ہوئے راج کے دل میں جیسے ایک ملکی بلکی پھوہار کے زم دنازک چھینٹے گرتے رہے تھے اور بھیگے اور فھلنے من سے اب کہیں سجدہ کرنے کو اس کی طبیعت چل رہی تھی۔

اس کے قدموں کے آگے بچھی ہوئی پکڑنڈی ایک چگہ پر دھصموں میں منقسم ہو گئی تھی اور جس سمت سے یاں سے بھرے نالے کی آواز آ رہی تھی اس کے قدم اس جانب گھوم گئے پہاڑی بغل میں ایک نالہ ایک اوپنجی چھلانگ لگا کر بیچے گرتا تھا۔ نالے کے کنارے پر مشکل ایک بالشت بھر ہوا رجھ کر تھی۔ سماں نے پہاڑ کی چوڑی پیچھے لٹھی۔ اور وہ ہوا رجھے اس پیچھے کے نزدیک نی ہوئی ایک دلہیز پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ راج کو اس دلہیز نے جیسے آواز دے کر ملا لیا اور اس دلہیز پر پاؤں رکھتے ہی راج کو ایسا لگا جیسے آج ایک کرامات جیسی کچھ بات ہو گئی تھی۔

وہ دلہیز ایک پہاڑی مندر کی دلہیز تھی۔ ایک بڑی چٹان نے جیسے اپنے سینے میں اس مندر کو جھک دی ہوئی تھی۔ بڑک پر سے گزرتے ہوئے یا پہاڑ پر چڑھتے ہوئے کسی کو خواب میں بھی اس مندر کا گمان نہیں ہو سکتا تھا اندر شیو اور پارتی کی کچھ مورتیاں تھیں۔ جو اس وسیع کالی چٹان کو تراش تراش کرنا می ہوئی تھیں اور جن پر قطرہ قطرہ بن کر پانی ٹپک رہا تھا۔ چٹان کے سماں نے بھیلے ہوئے ایک بڑے درخت کی ٹہنیاں مندر کی چھت کے ساتھ زور سے لپٹی ہوئی تھیں۔ جن کارنگ پانی سے بھیگ بھیگ کر لے ہے کے رنگ جیسا ہو گیا تھا۔

راج کا سر چھاک گیا۔ شیو سے، پارتی سے، یا اور کسی بھی دلوی دلوتا سے اسے کوئی درستہ صحبت نہ تھی۔ لیکن آج راج کو لوں محسوس ہوا کہ کیا مورتی کے پتھرا درکیا معمولی پتھر بھی جیسے دلوتا بن گئے تھے۔ اور اس کے

دل میں پوچا کا ایک گہرہ اور سنجیدہ جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ اس پوچا کے لئے کوئی ایک دیوتا سامنے نہیں تھا۔ لیکن رات کو لوں لگا آخر مانع ہی تو دیوتاؤں کو جنم دیتے ہیں۔ کھرات دیوتاؤں کی بہن ہوتی ہے۔ سجدہ کرنے والے مانع کی ہوتی ہے۔ اور آج اُسے اپنا مانع ٹراپ اور خوبصورت لگا۔ اُسے ذرے میں دیوتا بن جانے کا گمان ہوتا ہے۔

پانی قطرہ قطرہ بنکر راج کے سر پر، مونہہ پر اور بدن پر گرہا تھا۔ نہ معلوم کتنا وقت بیت گیا پسروں نے لوٹنے سے انکار کر دیا اور جسم کے انگوں کی ٹھنڈک میں سے راج کو لوں محسوس ہوا جیسے وہ بھی ابھی ایک مورتی بن جائے گا اور شیو کے پاس، پارتی کے قریب اُس کا بُت بھی کھڑا رہے گا۔ اس نے ایک بار باہر کی دُنیا کے بارے میں سوچا۔ پر اُسے لگا جیسے کسی نے بھی اُسے آواز نہ دی ہو۔ اور اب وہ وہیں کھڑا رہنے کے لئے تیار تھا۔ برسوں کے لئے.... صدیوں تک....

دائیں کندھے کے قریب راج کو لوں محسوس ہوا جیسے کسی نے حرم اور زندگی کی حرکت سے بھر لپر سا نس لیا ہو اور راج نے دیکھا انہوں کی بغل میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر سے کھڑی ہوئی ہو گی۔ کیونکہ بُوند بُوند گر رہے پانی میں وہ پوری طرح بھیگ ہوئی تھی۔ دونوں نے اس مندر کے چادر کو اپنے اندر بھرا ہوا پایا۔ اور دونوں کی نگاہوں میں ایک اطمینان تھا۔ پھر پُچاری آیا۔ سر سے لیکر پیٹک اُس نے ایک اُونی چغہ پہننا ہوا تھا۔ اُس نے ایک جنگلی پھول شیو کی مورتی سے چھووا اور پھر آدھا آدھا پھول

دولوں میں بانٹ دیا۔ ”بچہ، من میں پُچاکرو جو مانگو گے ماتما پارتی
دے گی۔“

راج کو محسوس ہوا عام پُچاریوں جیسی اُس کی آواز نہیں تھی سچرول
کی گونج میں سے جیسے ایک شیری اور پرکشید صدا آئی تھی۔ اونتے اپنے
حشمت کے آدھے پھول کو ہفیلیوں میں دیا یا اور مندر سے باہر آگئی۔ اوجیسے
باہر کی دُنیا کی آواز تھی۔ جس کے پیچے راج کو بھی مندر سے باہر آنا پڑا۔

راج اور اونتے جب چائے لی اور وہ واپس پھانکوٹ جانے
کے لئے تیار ہو گئے تو پُچاری نے پہاڑ کی پکڑنڈی کے پیچے سڑک کی طرف
اُترنے ہوئے انہیں سُمیرنے کا اشارہ کیا۔ مکن کی گرم روشنی، اُبلے ہوئے
چاول اور اڑکی دال تھامی میں رکھ کر پُچاری اُن کے لئے لارہا تھا۔

”دلیوتا کا پرشاد،“ اور پُچاری نے تھامی راج کے سامنے رکھ دی۔
پُچاری میں پُچاریوں جیسا غرور نہیں تھا۔ راج میں بھگتوں جیسا
یقین نہیں تھا۔ دولوں جیسے ایک جگہ کھڑے تھے اور اُس جگہ کی طرف دیکھ
رہے تھے جہاں زندگی حسینِ دکھائی دیتی ہے۔

”آپ چاہیں تواریخ میری کو ٹھہری میں رہ سکتے ہیں۔“

”و نہیں ہم آپ کو اتنی تکلیف نہیں دیں گے۔“

”میرے پاس دو چھوٹی کوٹھریاں ہیں۔ آپ چاہیں تو میں آپ
کو ایک دے سکتا ہوں۔“

پھانکوٹ واپس جانے کے لئے راج اور اونتے کو کوئی اشتباہ نہیں

تھا اُس چھوٹے سے شہر کے کسی ہوٹل کا کمرہ بھی اتنا ہی بیگنا تھا جتنی اس مندر کی کوٹھری۔

راج اور لوز نے اپنا اپنا بستر پُجاري کی کوٹھری میں رکھا دیا۔ سورج مغرب میں غروب ہوا تھا۔ پانی کی سفید رطہار پہلے شہری رنگ کی ہو گئی پھر رنگوں کی دل کشی بھی جاتی رہیں۔ شام اور گھری ہو گئی اور پانی کی آواز مزید اونچی اور دعست پذیر ہو گئی۔ اتنی اونچی اور دعست پذیر جس کے سامنے انسانی دل کی نحیت اور تھنی تھنی آوازوں کا کوئی وجود نہ رہ گیا ہو۔

لوز اور راج کو یہ سب کچھ بہت ہی قدر تی لگا۔ ان کے چہرے پر خوبی کی کوئی لکیر نہ تھی۔ اور ایک دوسرا کی طرف سے اتنی تسلی اتنا بقین دلوں کو ڈرا ہی خوبصورت رگا پھر کے چھوٹے ٹریزوں سے اور پانی کے چھینٹوں سے کھیل کھیل کر انہوں نے شام کو اور گھر اکر لیا۔ جب رات کی اولین نارکی میں سے چاند کی روشنی پھوٹ نکلی، اور جاڑے کی گھری کیپکی نے جب ان کے بدن کو جھنچھوڑا، تو وہ پانی کے کنارے کو چھوڑ کر کوٹھری کی چھٹت کے نیچے آگئے۔

دُور کونوں میں دلوں نے چار پائیاں بچھالیں۔ راج کے بستر میں گئے لڑکی ایک کتاب تھی۔ دیئے کی کانپتی لو میں بیٹھ کر کہتی ہی جگہوں سے وہ لوز کو کتاب سُنا تارہ۔ کتاب میں ایک جگہ ایک مطرپہ لڑکی کا ذکر آتا تھا وہ پیالوں بجاتی ہے، اس کا مصور درست قریب ہی بیٹھا سُن رہا ہوتا ہے۔ اور پھر سایلوں کے سروں میں خواب بیدار ہوتے ہیں... پھر راج اور لوز کو یوں لگا جیسے لنج کی رات گئے لڑکے ناول والی رات تھی۔ اور دلوں ان خوابوں کی گرفت سے کاٹ پکے گئے۔

تو اور آپ، کافر قہرے جانے کب کس وقت میٹ گیا تھا۔ اُو
لئے رات کے جادو کو اپنے پدن سے دُور پھینک کر لوچھا ”راج نہیں نہیں
نہیں آئی ہے“

”ابھی نہیں“

دوں خاموش رہے پھر خوابوں نے ایک لپیٹ میں کس لیا راج
لئے لوچھا۔ ”الو حسن کی انتہا تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ فن کا بھی کوئی اختام
نہیں ہوتا۔ لیکن پھرے برس مجھے پول لگتا تھا جیسے جو کچھ میں لئے تمہارے
گیت میں سُنا تھا ویسا کبھی کہیں نہیں سُنا تھا۔“

”ہمیشہ تو نہیں لیکن کبھی کبھی مجھے بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے
میں نے اپنے کسی گیت میں اپنی کسی چیز کو مرنے سے بچا لیا ہو۔“

وہ الو، جب مندر میں پُخاری نے کہا تھا، بچھہ لوچا کرو، اور جو مانگو گے
ماں پار تی دے گی، اُس وقت تو نے کیا مانگا تھا ہے؟“

”کچھ نہیں“

”کچھ بھی مانگنے کا خیال نہیں آیا تھا؟“

”میں پُخاری پار تی کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔“

”الو“

الو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ راج کی تمام چار پائی روشنداں
سے آتی ہوئی چاند کی چاندی میں شمرالو برتھی۔ اور اس چاندی میں راج
لئے جیسے اپنے دل کو پہلی مرتبہ دیکھا، اور جو کچھ، اُسے اپنے دل میں

دکھائی دیا۔ اسے اب وہ کسی سے چاہے چھپا لیتا، لیکن اپنی آنکھوں سے
نہیں چھپا سکتا تھا۔

”الوزنم نے زندگی میں کبھی پیار کیا ہو گا؟“

”ہاں۔“

”پھر۔“

”دل کے سوا دنیا کی ہر شے ہماری الگ الگ تھی۔ اس لئے ہمیشہ
الگ الگ ہی رہی۔“

”بہت دن ہو گئے؟“

”ہاں کئی برس۔“

”وہ اب کہاں ہے؟“

”ستی ہوں بہت دور ہے، بڑی زمین دنیا میں جہاں بھری
رسائی نہیں۔“

”دل میں بھی دُوری آ جاتی ہے الف؟“

”ہاں۔“

”کس بُکھر؟“

”جَب تک اُس کی بہت ہی شیرپ اور بہت ہی کڑوے
پانی کی پیاس نہیں مٹ جائے گی۔“

”عورت کے دل کو سمجھنا شاید بہت ہی مشکل ہوتا ہے الف؟“

”معلوم نہیں کیوں مجھے کلیر کی باد آئی ہے۔ کلیر نے کچھ مہینے

بائز کے ساتھ گزارے۔ اور پھر تمام عمر شادی نہ کی۔ اس کی اور بائز کی ایک بچی بھی نہیں۔ دو بچی بھی مر گئی۔ بائز بھی مر گیا۔ اور جب کلیر اسی برس کی ہو گئی، ایک صحفت اُس سے ملنے کے لئے گیا، وہ بائز کی زندگی کا خدا چاہتا تھا۔ اور کلیر نے اُسے زندگی کی سب سے بڑی سچائی بتانی۔ وہ میں بائز کے متعلق زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ میں نے اُسے پیار نہیں کیا۔ میری اور بائز کی ایک بچی ضرور ہوئی تھی۔ اور ادائی عمر میں ہی اٹلی کے ایک کاؤنٹ میں اُس کی وفات ہو گئی تھی۔ ”صحفت کو شیلے کی زندگی بھی لکھنی تھی۔ اور اُسے پہ معلوم تھا کہ کلیر شیلے کی بیوی میری کی بہن تھی اس نے اس کے بارے میں کچھ لوچھا۔ اسی سال کی عمر میں کلیر کے منہ پر جوانی لوٹ آئی۔ صحفت نے چران ہو کر لوچھا۔ ”کلیر تمہ شیلے سے پیار کرتی تھیں؟“ اور کلیر نے جواب دیا ”دل اور روح کے ساتھ“

کلیر کی کہانی ختم ہو گئی۔ انہوں نے اور راج دلوں کی تہوں میں کھو گئے۔ ”انہوں نے ایک نشہ ہوتا ہے۔ اور جب کسی کو اس کی عادت پڑ جائے وہ انتہائی کوششوں سے بھی بکھرے ٹھوٹوں کو اکھٹا کر لیتا ہے“ ”شاید“

”انہوں نے یہ نہیں کہتا کہ تم کسی کو بھول جاؤ۔ لیکن یاد کے ایک ٹکڑے سے تمام سورج کو روک کر رکھنا چاہیے؟“

”اندھیرے میں رہنے کی شاید مجھے عادت ہو گئی ہے۔ مجھے

یہ اچھا لگتا ہے“

”اگر اس تاریکی میں وہ پھر لوٹ آئے....“

”وہ....“
اور کہتے ہی لمحات کی خامشی کے بعد راج نے اٹھ کر اُنکے
ماستھے پر ہاتھ رکھا۔ اُنکا تمام حہرہ آنسوؤں سے گیلا تھا۔

بیس قدموں کی دُوری پر گرفتار ہے پانی کی آواز اور جنگل
پھولوں کی خوبصورتی سے چاندنی میں بھیگ کر آہی تھی۔ راج کے گرم
چھوڑے اور جوان ہاتھوں نے اُنکے ہاتھوں کو دبایا۔

”رات بڑی خوبصورت ہے“ راج کا سانس اُنکے
ماستھے کو چھوگیا۔

”اور اس لئے مجھ سے برداشت نہیں ہو سکی“

”اوہ“

”کیا دنیا میں ”وجہ“ ہی سب کچھ ہے“
”وجہ کی تسلی کے لئے بھی وجوہاتِ دھونڈھی جاتی ہیں“
”مجھے وجوہات کے سہارے کی ضرورت نہیں“
”پھر مجھ سے بھی وجہ پوچھنے کے لئے سوال نہ کرنا۔ لیکن اُن
زندگی کے باقی برس اگر میں تم سے مانگ لُوں؟“
”راج....“ اُنکے سانس میں سینکڑوں خوبصورتیں

تحلیل ہو گئیں۔

لیکن اوز نے خوشبوؤں کا جیسے گھونٹ بھر کر کہا ”راج میرے پاس اپ دینے لائق کچھ نہیں ہے۔“

”برسou سے برس بدلوالو امیری زندگ سے زندگ بدلو“

”انتہی حسین دل کے باسے میں میں کیا دوں گی؟“

”مجھے بدالے میں کچھ نہیں چاہیے اوز“

اوز نے اپنا چہرہ راج کی چوری اور سفید تھقیلیوں میں رکھ دیا۔ اور اوز کے آنسوؤں کا جیسے باندھ لٹٹ گیا۔

”راج تمہیں معلوم ہے اس وقت میرے دل میں کیا خیال

آیا ہے؟“

”جو کچھ بھی آیا ہے شہیک ہو گا۔“

”لیکن تمہیں شاید اچھا نہ لگے۔“

”اوجو کچھ تمہیں اچھا لگتا ہے، مجھے بھی اچھا لگے گا۔“

”راج وہ تم سے اچھا نہیں ہو گا، پر میرے دل میں یہ آیا ہے

کاش آج کے اس سفر میں تمہاری جگہ پر اگر وہ ہوتا ...“

راج نے جھٹ سے اوز کا ماتھا چوم لیا اور پھر اوز کی دولوں تھقیلیوں

کو اپنی آنکھوں سے لگالیا ”تمہاری سچائی کو میں پیار کرتا ہوں اوز“

”روزمرہ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی مشکلات میں شاید برداشت

نہیں کر سکتی، لیکن ”ٹری بجیدی“ جیسی ٹرمی باتیں میں برداشت کر سکتی ہوں۔“

پھر ایک مرد اور ایک عورت ہولے کا راز دنوں بھول گئے۔ اپنا دیاں بازوں اف کے سر ہانے پر رکھ کر راج نام رات چار پانی کی پٹی پر پیٹھا رہا۔ نیت لئے ایک لمبے بھی نہ ان سے چھینا اور وہ ساری کی ساری رات ان کے حوالے کر دی۔ اور پھر لوپ لئے رات کے چاروں کناروں میں کرنیں باندھ دیں۔

صبح کی آلیں سُنہری کرنوں میں راج اور اف نے اٹھ کر کچھ جنگلی پھول توڑے اور پھر مندر کی دہیز پارکی۔ بوond بوند گرہا پانی انہیں ایسا لگا جیسے دلوی کی فہر بس رہی ہو۔ یہاں اُنھوں نے ایک دوسرے کو ڈھونڈا تھا۔ انہیں لگا جیسے ہر ایک پتھر آج دیوتا بن گیا ہو، اور اُنھوں نے پھولوں سے بھری ہوئی مٹھیاں چاروں طرف بکھیر دیں۔

اف کے کاندھے کے پاس جھاک کر راج نے ایک گمراہ سن اپنے اندر کھینچا، اف کے بھیگے ہوئے بدن کی خوشبو اُس میں ملی ہوئی تھی، اور راج کو لوں فحسوں ہوا جیسے وہ دلوں زندگی کے ایک بیش قیمت پھول سختے لیکن دلوں ایک ہی زمین پر اور ایک ہی موسم میں پروان نہیں چڑھ سکتے تھے۔

صبح کے سفر میں ایک جگہ راج کی گاڑی مشکل ٹھکر سے بچی، اور اس وقت گاڑی اُلٹئے لگی تھی، اف نے زور سے راج کا بازو تھام لیا تھا ”مجھے آج موت سے خوف نہیں آ رہا“ اور راج نے اف کا ہاستھ اپنے ہاتھ میں بھینچ کر کہا ”موت کبھی اتنی حسین نہیں ہو سکتی“

جو کچھ انہوں نے ایک ذریعے سے حاصل کیا تھا، نہ اُس سے
مزید حاصل کیا جاسکتا تھا، اور نہ وہ حاصل کیا ہوا کبھی کم ہو سکتا تھا۔
اس لئے پھر راج اور ان کبھی نہ ملے۔

آج جب راج کی گاری مندر کے موڑ کے قریب سے گزی تو
راج نے گاری روک لی اور اپنے پاس بیٹھی ہوئی لال جوڑے والی لڑکی
سے کہا ”پانچ منٹ میرا انتظار کرو گی؟“
”بیس ساتھ آؤ؟“
”نهیں“

راج نے اپنے شہر سے منبعہال کرائی ساتھ لائے ہوئے متیا
کے پھول نکالے اور پھاڑ کی پتی پکڑنڈی پر چڑھتا ہوا او جھل ہو گیا۔

اور جب کچھ منٹ بعد راج والپس آیا تو اُس کی بیوی نے پوچھا
”وہاں کیا تھا؟“

”ایک مندر“
”آپ نے پھول چڑھائے ہیں؟“
”ہاں“

راج نے پھر کر کہا ”جب انسان مر جاتے ہیں، اُس

کی ٹہریوں کو کیا کہتے ہیں؟ ”
”و پھول“

”تم ایک بات یاد رکھوگی؟“
”رکھوں گی“

”جب میں مر جاؤں، میرے پھول یہیں چڑھا جانا۔“
بیوی نے سمجھے ہوئے چہرے سے ایک بار راج کی طرف دیکھا
راج کے چہرے پر ایک مرد کا وہ حسن تھا جو ہزاروں میں سے کسی ایک
کو لفظیب ہوتا ہے۔ اور راج نے مُسکرا کر کہا ”اس مندر پر وہ پھول
بجھی چڑھائے جاتے ہیں“

چاندنی رات

مشتملی میری چھوٹی بہن کا نام تھا۔ وہ مخفی چوبیں گھنٹوں کے لئے
میری بہن تھی۔ کل سے پہر اُس نے میرے ساتھ یہ رشتہ استوار کیا تھا
اور آج دوپہر یعنی ابھی ابھی جب میں نے ڈاکٹر سین کے ہسپتال میں فون
کیا تھا تو کوئی کہہ رہا تھا ”دشمنی ہے کون شیما ما؟“ اچھا تو آپ کی ہراد
ہسٹری اجیش سے ہے ۰۰۰۔ ہسٹری اجیش کا توانی مقال ہو گیا ہے۔ یہی
کوئی ایک گھنٹہ ہوا ۰۰۰۔“

کل یہی وقت تھا، دوپہر کا، جب میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بھی
تھی اور سی لئے پوچھا تھا ”فایو ون فایو نائن فایو“
”جی ہاں“

”امر تہ پرستیم؟“

”جی ہاں“

”دیدی!“

”میں نے پہچانا نہیں“

”آپ نہیں پہچان سکتیں دیدی۔ آپ مجھے نہیں جانتیں۔ میرا نام شیما ہے۔ مگر آپ صحیحے شتمی کہہ کر پکاریں میں عرصہ سے آپ کو اپنے من ہی من میں دیدی کہہ کے پکارتی رہی ہوں۔“

”شتمی!“

”یہاں میں ایک ہسپتال میں ہوں، ڈاکٹر سبین کے ہسپتال میں کمرہ نمبر ۴۳۔ دیدی ایک بار آکر مل جاؤ، آج میں بڑی مشکل سے ڈاکٹر صاحب سے اچازت لیکر کمرے سے باہر آئی ہوں۔ سوچتی تھی کہ کسی اور کے پلاں سے شاید آپ نہ تشریف لایں۔ آپ ضرور آئیں دیدی.....۔۔۔۔۔ نہیں کل نہیں دیدی۔ آج ہی آئیں۔ کیوں کہ زندگی کے پاس کئی دفعہ ”کل“ کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔“

”اچھا ملاقات کا وقت کیا ہے؟“

”سارٹھے چار سے سارٹھے سات تک“

”کمرہ نمبر چھتیس..... اچھا شتمی میں آؤں گی۔“

”ضرور آنا دیدی! میں آپ سے باتیں کرنے کے لئے کمرے میں تنہا ہی رہوں گی۔“

اور جب میں نے پانچ بجے شمی کے کمرے میں قدم رکھا تو شمی نے
بستر سے اپنے دلوں بازو پھیلایا کر کہا تھا۔ ”دیدی“
خدا جانے شمی کے لبوں پر کیا تھا کہ اُس نے محضن ایک لفظ کہہ کر
میرے ساتھ یہ ناطہ جوڑ لیا تھا۔

جب میں نے آپ کا داکر دیو، پڑھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ
کہ جیسے میں ہی مبتا ہوں اور آپ نے میری داستان تحریر کی ہو....
پھر میں نے ”گھونسلہ“ پڑھا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں ہی نینا ہوں

اور آپ نے _____

شمی کا گلارندھ گیا

”تمہیں تکلیف کیا ہے شمی؟“

”زندگی نے مجھ سے مذاق کیا ہے دیدی! متواتر پانچ سال سے
اس کے ستم کا باراٹھائے اٹھائے پھر رہی ہوں... اور آپ تھاک
گئی ہوں... اب اور ستم...“

”و شمی؟“

”جب میں نے مجھت کے حروف پڑھنے شروع کئے تو زندگی
لئے میرے سامنے دو ٹھیاں میں رکھ دیں۔ ایک میں زندگی کا فلسفہ تھا،
زندگی کا گیان تھا، زندگی کا حل تھا۔ دوسری میں دلچسپ کہا بیاں تھیں۔
اور چند رنگیں و شوخ تصویریں۔ پہلی کتاب مجھے مشکل نظر آئی اور میں نے
زندگی کا ویداگ رکھ دیا۔ اور دوسری کتاب کی رنگیں تصاویر میں محو

ہو گئی۔ جب دل کے معنی سمجھنے شروع کئے تو مجھے میری کہانیاں تسلیم نہ دے سکیں اور پھر جب میں نے پلٹ کر زندگی کے وید کو چھوپنا چاہا تو زندگی نے وید میرے ہاتھوں سے چھین لیا.....
”دشمنی“

”بے کیساالمیہ ہے دیدی! پرستی بھی ہمارے ہی کارج میں پڑھتا تھا۔ اور راجیش بھی! پرستی کے پاس کھڑی ہو کر جب میں اُس کے سنجیدہ اور گہرے چہرے کی طرف تاکتی تو مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا معلوم ہوتا۔ میں زندگی کے اس فلسفہ کے سامنے بالکل انجان اور بے معنی سی دکھانی دیتی۔ لیکن جب میں راجیش کے پاس ہوتی تو اُس کے ساتھ روکھ بھی سکتی تھی۔ اور ان بھی جاتی... گر پرستی کو دیکھ کر میرے دل میں اُس کے لئے تعظیم کے وجود بات بھر جاتے اُن کا میں اس کے سامنے انہیاں تک نہ کھپاتی۔ میری شادی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ میرے آتا پتا نے مجھے اجازت دے رکھتی تھی کہ میں جسے چاہوں اس کا انتخاب کروں، اور میں نے راجیش کو چھن لیا۔“

”پھر“

”ابھی ہماری شادی میں ایک وجہیہ باقی تھا کہ پرستی نے ایک دن مجھ سے کہا کہ ایک دن کے لئے اُس کے ہمراہ پنجور کے مغل باغ چلو۔۔۔ جہاں تک اُس پر اعتبار کا سوال ہے، مجھے اُس پر مکمل اعتماد تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ یہ اُس کی پہلی اور آخری خواہش تھی۔ میرے پاس اُسے مایوس

کرنے کی سکت نہ تھی۔ میں نے ہاں کہہ دی....”

”پھر ششمی؟“

”پنجور دلی سے کوئی ڈیرھ سومیل کے فاصلہ پر ہے۔ پر تھی کی اپنی کارخانی اور اس کا اپنا ہمراز بورھا ڈرائیور اسے ڈرائیور کر رہا تھا۔ ہم کوئی پانچ گھنٹوں میں پنجور پہنچ گئے... راستے کی ایک بات بتاؤں دیدی؟“

”ہاں ششمی!“

پنجور سے کوئی دس میل اس طرف کھجور کے جنگلوں کا درخت آتا ہے۔ یہاں کچھ دیر کے لئے ڈرائیور نے گاڑی روک لی کیونکہ انہیں گرم ہو گیا تھا۔ تاحد نظر کھجور کے درخت ہی درختِ دکھانی دیتے تھے، اُس جنگل نے مجھے سحو کرنا شروع کر دیا... سڑک کے باینے طرف ایک کچا مکان تھا۔ جس کے آنگن میں ایک حیثیتی ہے کہ پر گوٹہ کناری لگی ایک اور حصہ تھی۔ اور مٹی سے لپے ہوئے آنگن میں سُرخ مرچیں سُوکھنے کے لئے پھیلا رہی تھی۔ اپنی لانبی یا ہیں پھیلا کر جب وہ مرچیں بکھرتی تھی تو اُس کا لال چوڑہ چھپتا تھا۔ چوڑت کے پاس پڑی چار پانی پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ پر رہا... کش لیتے ہوئے اُس نے دو شیزہ کو پکارا۔ اور وہ دست پناہ سے انگارے لائی۔ چلیم پھر سلاگ اٹھی۔ نامعلوم یہ کون سی چنگاری میرے دل میں اڑا کر آگئی تھی۔ یا اُس کے چوڑے کی جھنکار کا معجزہ تھا یا اس صحن میں سُوکھنے کے لئے ڈالی مرحوم کا غبار تھا یا کھجور کے درختوں کا جادو... میں نے دیکھا کہ میں گولے کناری سے مرصح اور حصہ سر پہ

اوڑھتے ہوئے ہوں، میری کلائیوں پر سہاگ کا عروضی چوڑہ ہے اور میں سُرخ
مرچیں آنکھ میں پھیلائی ہوں۔ سامنے کھاٹ پر پرستی بیٹھا حلقہ گردگرد
رہا ہے۔ پرستی نے مجھ سے آگ مانگی ہے ۰۰۰۔۔۔

”پھر؟“

”ڈرائیور نے کارسٹارٹ کی۔ میں نے خود کو سنبھالا۔ دس میل
کا فاصلہ منٹوں میں طے ہو گیا۔ پرستی نے پہلے سے ہی دو مکروں کا انتظام
کر رکھا تھا۔ سامان کمرے میں رکھ کر ایک کھڑکی میں آجھڑی ہوئی کمرے
کی ایک کھڑکی پائیں باغ کے پہلو میں کھلتی تھی۔ ایک منزل سب سے
بلند تھی۔ دوسری اُس سے کم، تیسرا اس سے بیچے۔ باغ کی سات منزلیں
تھیں۔ ان سالتوں منزلوں پر سہروں کے پودے، آم اور لیچیوں کے درخت
تھے۔ گلہر گلاب اور چاندنی جیسے رنگارنگ کے پھول چڑک رہے تھے۔
مجھے ان کے سحر سے ڈر لکنے لگا۔“

”ڈرائیور نے سٹوڈ جلاکر چائے تیار کی، اور ایک ایک پیاں
پی کر میں اور پرستی ”کوشلیاندی“ کا نظارہ کرنے چلے گئے۔ ندی کوئی ایک
میل کے فاصلے پر تھی۔ پیدنڈی سے بیچے اُتر کر جب ہم ندی کنارے
پہنچے تو پانی کے لمبے نے میرا باتھ تھام کر مجھے بلا یا۔ میں نے پرستی سے
کہا ”میں تو ندی میں نہاؤں گی۔“ فلاک بوس پہاڑوں کی سرہنخ
دیواریں بلند تھیں۔ جن میں گھری ہوئی کوشلیاندی بہہ رہی تھی۔
سامنے ہری ہری میٹھیوں کی صورت پھیلے ہوئے کھیتوں کا لامتناہی

سلسلہ تھا۔ کچھ فاصلے پر آموں کا ایک جھنڈ تھا پہاڑ کی ایک چوٹ پر ایک بوڑھی پئائیں بکریاں چڑھی تھی۔ ندی ریتیلی اور پھریلی دیوار کے ساتھ ساتھ سمت سمت کر چل رہی تھی۔ اس لئے چند قدموں کے فاصلے بھی اوت دے دیتے تھے پر تھی دوسری طرف چلا گیا اور میں لاپرواہی سے ندی میں نہالنے میں محو ہو گئی۔ جب میں نہارہی تھی دیدی تو...“
”ہاں شرمی!“

”میری کلائیوں پر کانچ کی سُرخ چُڑیاں تھیں۔ پانی میں ڈوبی ہوئی اپنی باہیں مجھے پہلی بار بھلی معلوم ہوئیں۔ چُڑیوں کا سُرخ رنگ مجھے شکنوں کا زنگ فحسوس ہوا یہ شاید پہلا موقعہ تھا دیدی جب میرے اندر کہانیوں کی کتاب کو ایک طرف رکھ کر زندگی کا وید پڑھنے کی خواہش لئے سراہا یا“

”و شاید دوسری بار شرمی!... پہلی بار اس وقت جب تم کھجروں کے جنگل میں... صر پگو لے کناری کی اڑھنی لئے تم کچھ آنکن میں سُرخ مرپیں پھیلائی تھیں اور پر تھی کھاٹ پڑیا حصہ پر رہا...“

”ہاں دیدی پہلی بار وہی تھی۔ اور یہ دوسری—“

”پھر؟“
”سائے ڈھل کچے تھے۔ میں ندی سے باہر آگئی۔ اپنا بدن سُکھایا کپڑے پہن کر پتھی کو ڈھونڈ لئے لگی۔ ریت کے پھریلے کنارے پر نیچے

ہوئے میں نے اُسے پایا۔ وہ نہا چکا تھا لیکن ابھی تک اُس نے پوری طرح کپڑے نہیں پہننے تھے۔ وہ ایک بڑی چین پر خاموش بیٹھا سگر سٹ پر رہا تھا۔ سورج کی آخری کرنیں اُس کی پیٹھ کو تاباں کر دی تھیں۔ یہ تابانی میری آنکھوں کو خیر کئے دے رہی تھی... اور میں نے آنکھیں چھکائیں۔ مجھے دیکھ کر اُس نے کپڑے پہن لئے۔ پھر ہم پہاڑ پر جانے والی پلڈندی پر ہوئے۔ راستہ پر بجایاں چرانے والی پہاڑن نے اُسے آواز دے کر پوچھا کہ میں نے دلوی کے استھان پر کیا چڑھایا تھا، اور کیا مراد مانگتھی؟ لیکن میں تو ندی کے پانی کی روائی میں ہی گم ہو گئی تھی۔ اور نزدیک کسی بھی استھان کو تو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی مراد مانگتھی۔ میں نہیں کریں دی... دیکھی، جو سچ پوچھو تو میں پڑھی لکھتھی تھی، کبھی کسی وہم کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے اس وقت مجھے کیوں محسوس ہوا کہ جیسے میں کسی مراد سے فیض یا ب نہیں ہو سکی۔

”پھر شتمی؟“

”ڈرائیور نے کھانا تیار کر کھا تھا۔ تھوڑا سا کھایا۔ اور پھر میں اور پرستھی باغ میں بیٹھ کر پہاڑوں کی اوٹ سے طلوع ہوئے چاند کا نظارہ کرنے لگے۔ درختوں کے سنولائے چہرے نور میں دھونے کے میں منتظر تھی کہ شاید پرستھی مجھ سے کچھ کہے... مگر وہ خاموش رہا... ایک جگ پانی کی تیز و قند آبشار تھی اور پھوارے سخنے میں اور پرستھی ان کے پاس سمجھنے ہو کر سخنی مسقی پھوار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سردی کی ایک

ہلکی سی کپکپی میرے تمام جسم میں صراحت کی پرستی میرے پچھے کھڑا تھا۔
میرا دیال کنڈھا اس کے سینہ سے چھوگیا تو ایک خوش گوارگی کندھے میں
صراحت کرنے لگی۔ سامنے پھر کی دیوار میں دیپے جلانے کے لئے چھوٹے
چھوٹے طاق بنتے ہوئے تھے۔ کہہ نہیں سکتی کہتے ہوں گے۔ میرے کم تو پیا
ہوں گے۔ مجھے تھوس ہوا کہ پرستی کے جسم کی گرفتی میرے کندھے میں شامل
ہوتی ہوئی اب میرے اپنے دل کی آنکھیں گئی ہے۔ اور اس آنکھ سے سامنے
کے دیوالیں میں رکھے دیے خود بخود جل اٹھتے ہیں۔ . . . دیدی ۔ . .

دیدی!

”ہاں شرمی!“

”میرے جی میں آئی کہ جو آگ مجھے جلانے چاہی ہے۔ اس کی
بات میں نہ کہوں، پرستی کے ملکر پرستی لے کچھ نہیں کہا۔ اس کا چہرہ
ہمیشہ کی طرح کسی بھی اثر سے لے پیاز تھا۔ . . میں اپنی آگ سینہ
لگی۔ . . کافی رات گئے ہم بارغ سے لوٹے۔ . . اور اپنے اپنے
کمروں میں صونے کے لئے چلے گئے۔

دیدی! اُس رات میرے سینوں نے کئی چراغ روشن کئے میں
لئے دیکھا کہ وہ بارغ میرا ہے۔ میں ایک مغل شہزادی ہوں، جو رات کو
تن تنہا گھوم رہی تھی۔ سرو کے پوتوں کو میں لئے اپنے ہاتھوں سے
چھپھوا۔ سرخ گلابی کو توز کر میں لئے اپنے پالوں میں سچایا۔ پھر پانی کے
چشمتوں کے پاس کھڑی اور کریں خالی طاقوں پر دیپے جلا جلا کر رکھنے

لگی۔ ایک دبیے کی لودوسرے دبیے سے چھوٹی گئی اور پھر آبشار کی اوڑ میں پتھر کے طاقوں میں کوئی سوا یک دبیے جل آئھے کہ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ پانی کی پھوار سے کپکپائے جسم میں ایک دل نواز گرمی کی لہر دوڑ گئی۔ اور میں نے پلٹ کر دیکھا تو پرستی ایک مغل شہزادہ بنا کھڑا تھا جس کے یہوں کی سالش میرے یہوں سے گزر رہی تھی۔ میں اس پسند کی تاب نہ لاسکی اور وہ لوٹ گیا۔ میرے قدم حرکت میں آگئے۔ میں پرستی کے کمرے کی طرف بڑھی، تاکہ میں اس پر اپنایہ پینا ظاہر کر دوں اور پھر اس سے کہوں کہ اگر وہ اس پسند کو حقیقت میں بدل دے تو مجھے دُنیا میں اور کچھ نہیں چاہیے۔“

”پھر شتمی؟“

”میری تقدیر نے میرے قدموں کو تحفام لیا۔ میرے دل نے جو دُنیا اپنائی تھی، وہ اپنائی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ مجھ سے اب کوئی پرستی کو علیحدہ نہیں کر سکتا۔ میں نے سوچا اب میں انجان نہیں تھی۔ اب مجھے زندگی کے وید کو پڑھنے کا سلیقہ آگیا تھا۔“

”پھر شتمی؟“

”دیدی جب میں صبح بیدار ہوئی۔ تو زندگی نے میرے ساتھ اپنا فریب مکمل کر لیا تھا۔ پرستی مجھے کہیں نہ ملا۔ میں نے اُس کا مرہ برآمدہ، غسل خانہ اور باغ کا چھپہ چھپہ جھان مارا۔ دراٹر اپور نے مجھے بتایا کہ ”صاحب آدھی رات کو ہی چل دے تھے۔ اور میں انہیں کا لکھا تاکے۔“

چھوڑ آیا ہوں۔ وہاں اکھنوں نے میکسی لی تھی... اب آپ جب کہیں
وہلی لے چلوں گا۔ گاڑی باہر کھڑی ہے۔ اردو گرد کی تمام دیواروں کے پتھر میں
پاؤں سے بندھ گئے رکھتی دیر بعد میں جب پسترباندھنے لگی تو دیکھا کہ تنکیے کے
نیچے پر تھی کا لکھا ایک خط تھا۔ خط نہیں محفوظ و سُطُریں:

چکنانہ کر سکوں گا اپنا حساب مجھے سے
یہ رات چاندنی جو میں نے اُدھار لی تھی

”شمی! اکیسا ہو گا تیر پر تھی؟ ایسی مجھیتا اور سنجیدگی تو انسانوں میں
نہیں دیوتاؤں میں پائی جاتی ہے۔“

”اسی سنجیدگی نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑ دیدی!“

”پھر شمی؟“

”میں دری لوٹ آئی۔ مگر مجھے پر تھی کا کہیں کوئی سرانع نہ ملا۔ نہ
اُس کے گھروالوں کو کوئی پتہ چلانہ مجھے... ایک برس بیت گیا۔ سب نے
سوچ لیا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ زندگی کا فریب میں نے اپنے دامن میں
لیکر راجشیں سے شادی کر لی۔“

اب ایک برس ہوا میں نے پر تھی کی تصویر اخباروں میں دیکھی۔
لندن میں اس کی نظموں کا ترجمہ چھپا ہے۔ اس کا نام اب دنیا کے مشہور
شاعروں میں گینا جاتا ہے۔ مگر وہ رات جو اُس نے مجھ سے مستعاری تھی، اور
کہا تھا کہ اس کا حساب اُس سے کبھی بھی چکایا نہ جا سکے گا، اب وہی حساب
مجھے چکاتا پڑ گیا ہے۔ میں زندگی کے ساتھ اس کا حساب چکا نہیں سکتی تھی میں

موت کے ساتھ اپ وہ حساب چکا کر دیں گی دیسی۔"

"نہیں شتمی! ازندگی کے ساتھ حساب چکانا ہی بہادری ہے۔ یہ حساب موت سے نہیں چکایا کرتے۔ زندگی موت سے کہیں مشکل ہے شتمی"

"مگر اپ میں تھک گئی ہوں دیدی۔ درلوں پھیپھڑے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ کین ہونٹوں سے اُس کو لپکاروں؟ کن آنکھوں سے اُس کی راہ دیکھوں؟"

آج رات پانچ سال پہلے کا سینا پھر آیا۔ وہی باغ ہے، وہی آبشار ہے۔ میں اسی طرح مغل شہزادی ہوں۔ پتھر کے طاقوں پر میں نے دئے روشن کئے ہیں۔ مگر پتھی کہیں نہیں ملتا۔ پھر طوفان اٹھا۔ سنستاتی سیڑیاں بجا تا ہوا طوفان اور میرے تمام چڑائی ٹکل ہو گئے۔ گھوراند ھیرا چھا گیا۔ بہت گھوڑا بہت گھرا... ۔۔۔

اسی لئے آج مجھ سے برداشت نہ ہو سکا دیدی۔ پتھی کو میرا سینا بتا۔ والا بھی کوئی نہیں تھا۔ جب میں اُسے بتانے چلی تھی تو وہ اُسے سُننے سے پہلے ہی چلا گیا۔ اور آج میں ہی وہ سینا دیکھتی دیکھتی جانے والی ہوں۔"

"نہ شتمی یوں نہیں کہتے!" میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"دیدی! آپ میری دیدی بن جائیے، بڑی دیدی۔"

"شتمی!" میرے لئے بولنا محال ہو گیا تھا۔

"سب مجھے شیا ما کہہ کر لپکارتے ہیں۔ ایک پتھی مجھے شتمی کہتا تھا۔ اور ایک میرا دل چاہتا ہے کہ آپ فُکاریں۔ ایک اپنے پتھی کے

سوالے اور ایک اپنی دیدی کے سوالے میں کہی کی شتمی نہیں ہو سکتی۔“
”و شتمی!“

”دیدی، آپ نے کسی مبتا کا افسانہ لکھا تھا۔ کسی نینا کی داستان تھی۔ آپ اس نامزاد شتمی کی کہانی بھی لکھ دینا۔ شتمی کا وہ سپنا بھی لکھ دینا جس کو پرنسپل نے کبھی نہ سنایا اور اس کو کہنا کہ شتمی کی زندگی میں چاندی رات محض ایک ہی بار آئی تھی....“

میں کل سات بجے شتمی کی بجارتی پرلوسر دے کر آئی تھی۔ یہی سہ پہر کا وقت تھا جب اس نے مجھے دیدی کی کہا تھا۔ اس کے ہنڑوں پر نہ جانے کون ما سحر تھا کہ ایک لفظ کی ڈوری سے اس نے میرے سامنہ اس رشتے کی گناہ پکی تھی۔ ابھی پورے چوبیس گھنٹے بھی نہ ہونے پائے کہ وہ زندگی کے سارے رشتے ناطے توڑ کر چلی گئی۔ ہسپتال میں سے میرے فون کا جواب آپا ہے۔
”شتمی! کون شیما ہے اچھا تو آپ کی مرا درہ مسز راجیش سے ہے۔ ... مسز راجیش کا تو انتقال ہو گیا ہے ... یہی کوئی ایک گھنٹہ ہوا ...“

شتمی نے سب سے اپنے رشتے توڑ لئے ہیں۔ مگر جن دلوں میں اُس نے محبت کے رشتے استوار کئے ہیں۔ انہیں موت بھی نہیں توڑ سکے گی۔ دُنیا والوں کی شیما مر گئی ہے۔ لوگوں کی مسز راجیش گزر گئی ہے۔ مگر میں یہ نہیں مان سکتی کہ میری شتمی کا انتقال ہو گیا ہے۔ شتمی اپنی دیدی کی کہانیوں میں زندہ رہے گی۔ شتمی اپنے پرنسپل کے گیتوں میں زندہ رہے گی۔

ہیل کمل

چھپت کا مہینہ تھا۔ رات تاروں سے بھری ہوئی تھی بنیاد میری آنکھوں میں آتی ہی نہ تھی۔ میں نے سر رانے پڑے ہوئے یہ پکو روشن کیا اور اس کی روشنی میں پڑھنے لگی۔

وہ موسیقی! تو نے میری غمگین روح کو جفنجھوڑ دیا ہے موسیقی تو نے مجھے قوت، سکون اور صستی دی ہے، میرے پیارا! میری دولت میں تیرے پاکیزہ لبؤں کو خوب تھا ہوں، میں تیری شیریں زلفوں میں اپنا منہم چھپا لیتا ہوں۔ میں اپنی آنکھوں کی تپتی ہوئی پلکیں تمہاری تھستڈی ہھٹیلیوں پر کھو دیتا ہوں۔ ہم مونہہ سے کچھ نہیں کہتے، ہماری آنکھیں بند ہیں۔ لیکن میں تمہاری آنکھوں کا ناقابل بیان نوزدیکھ سکتا ہوں۔

— اور میں تمہارے خاموش بیوی کی مُسکراہٹ پیتا ہوں — اور میں
تمہارے بیٹے سے لگ کر لا فانی زندگی کی وصیر کن سُختا ہوں ”
جیسیں حرصٹاف کے یہ بول پیاؤ کے سڑوں کو چوتھے رہے۔ اور میں نے
لیمپ گل کر کے ایک بار پھر تاروں کی روشنی کو آنکھوں میں بھر لیا اور پھر
آنکھیں بند کر لیں۔

کسی کے سالن مجھے گردان کے قریب محسوس ہوئے۔ میں چونک کر
جگ پڑی۔ میرے سر پانے ایک پری صورت عورت کھڑی تھی۔ اس کے
باہم میں سر سے پاؤں تک تارے جڑے ہوئے تھے۔

میری آنکھیں اس کے حسن کی تاب نہ لاسکیں۔ نور کی اس ندی
میں جیسے خوبصورت کی ایک لہر آئی، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں لہروں
میں سما گئی ہوں۔ ایک بار پھر میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، اس
کے بالوں کی ایک ایک تار میں پھول گندھے ہوئے تھے۔

” تو ایک بار میرے ساتھ آئے گی؟ ” موتیوں کی جنکنکار جیسی
اُس کی آواز آئی۔ اس نے اس انداز سے بات کہی کہ دنیا کا کوئی شخص اسی
انکار نہیں کر سکتا تھا، اُس نے میرا باتھ پکڑا اور کئی راہیں ہمارے پاؤں
کو جھپوٹی رہیں۔

پھولوں کی پیوں کو جوڑ کر جیسے کسی نے ایک محل بنایا ہو،

میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو سچ مجھ پھولوں کی پتیاں ہی تھیں۔ لیکن نہ جانے وہ کس سہہارے پر تھیں، پھولوں کی دیواریں اور پھولوں کی چھتیں، اور پھولوں ہی کے فرش تھے پھولوں کی سیچ پر بیٹھے ہوئے اُس نے کہا ”آج میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گی جب میرے دل میں بہت زیادہ درد ہوتا ہے اُس وقت میں اسی طرح کسی کو اپنے پاس بھاتی ہوں اور پھر جب میں اپنی پوری کہانی سناتی ہوں تو مجھے کچھ سکون شامل جاتا ہے ۔۔۔“

پھولوں کے گھر میں رہنے والی اور ستاروں کا لباس پہننے والی عورت کو بھی غم ہو سکتا ہے، میں کچھ سمجھو نہ سکی۔

”تمہیں کتابیں پسند ہیں نا۔۔۔“ اُس نے کہا۔

”میرے پاس صرف یہی تودولت ہے، اور کوئی بھی دولت مجھ سے زیادہ خریز نہیں ہے۔۔۔“

”اسی لئے میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گی، ان چھتی کتابوں میں بھی میری ہی پاتیں ہوتی ہیں، لیکن آج میں اپنے مو نہہ سے تمہیں اپنی کہانی سناؤں گی۔۔۔“

میری ماں کا نام دھرتی ہے میں ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی، ایک دن اُس نے سوچا، میں اپنا گھر تو روز بھولوں سے سجا تی ہوں، آج میں لوگوں کے راستوں کو بھی پھولوں سے سجاوں گی۔۔۔

اُس دن اُس نے سب راستوں پر بھول بچھائے ہوئے تھے۔ اُس دن زندگی اپنے محبوب سے ملنے کے لئے جا رہی تھی۔ اُس کے پاؤں کو بھول

بہت اپنے محسوس ہوئے اور اُس نے کئی پھول اپنے جوڑے میں لگا لئے اور کئی پھول پر کر اُس نے اپنے بازوں پر پیٹ لئے اور میری ماں کو دعا دی کہ اُس کے ہاں ایک ایسی لڑکی پیدا ہوگی جو دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت بنت ہوگی۔

”میں اُس کا نام کیا رکھوں ہے؟“ میری ماں نے پوچھا
”اُس کا نام محبت رکھ دینا،“ زندگی نے کہا اور پھولوں سے بھرے ہوئے راستوں کو طے کرنی ہوئی اپنے مجوب سے ملنے کے لئے چل گئی جب میں پیدا ہوئی تو میری ماں نے زندگی کے کہنے کے مقابلے میرا نام محبت رکھ دیا۔“

زندگی نے دھرتی کو کہنی اچھتی دعا دی، میں نے ایک بار پھر اُس دیلوی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”پھر ایک دن میری ماں نے باغوں کے سب ہی پھول لے کر اپنے گھر کو سجا دیا، اُس دن لوگوں کے سب ہی راستے ویران ہتھی، ماں نے پھولوں کے کانٹے الگ کر کے پھینک دیے اور پھولوں کی پیتوں سے اپنا سنگھار کرنے لگی، اُس دن بھی زندگی اپنے مجوب سے ملنے کے لئے چارائی تھی۔ جب وہ ہمارے گھر کے سامنے میں گزری تو ماں کے پھینکے ہوئے کانٹے اُس کے پاؤں میں برمی طرح چبھو گئے۔“

زندگی کے پاؤں ہوا ہان ہو گئے اور اُس نے میری ماں کو بد دعا دی کہ اس کے ہاں ایک ایسی لڑکی پیدا ہوگی جو دنیا کی سب سے زیادہ

پدھورت غورت ہوگی۔ اُس کا نام لفڑت ہوگا۔

میری ماں روئے تکی۔ لیکن غصے میں بھری ہوئی زندگی لئے اپنی پدھورت دعا والپس نہیں۔ جب میری ماں کے ہاں دوسری لڑکی پیدا ہوئی تو وہ واقعی پدھورت تھی اور اُس کے سب اعضا میں زہر بھرا ہوا تھا۔

”وہ اس وقت بھی زندہ ہے جو“ میں نے سمجھے ہوئے پوچھا

”ہاں! وہ زندہ ہے، وہ جسے بھی چھوٹی ہے اس کے جسم میں

زہر بھر جاتا ہے۔“

”دوزہر“

”میں تمہیں وہ لوگ دکھاؤں جنہیں اس نے ڈنک مارے ہیں۔“ میں ڈرگئی، سچھر اگئی اور اس دیلوی کے آنچل کو تھاہم لیا۔

”درودت میں دو رہی سے تمہیں دکھاؤں گی۔“ اور اُس نے پھولوں کی ایک کھڑکی کھولی۔

پھولوں کے محل سے کوئی سو گز درسامنے آگ جل رہی تھی۔ ارد گرد لوگوں کا جھرمٹ تھا مرد بھی تھے، عورتیں بھی۔ جب آگ کی لپیں ایک پار پلندہ ہوئیں تو میں نے غور سے دیکھا کہ جسم کی بنادٹ سے جو لوگ مرداور عورتیں ظاہر ہوتے تھے ان کے مو نہہ سماپنوں کے مو نہہ کی مانند تھے پا تھے، پاؤں، ٹانگیں، با نہیں سب آدمیوں جیسی تھیں لیکن ان کے سماپنوں کے مو نہہ کی مانند مو نہہ سے لال لال زبانیں نکل کر آگ کو چاٹ رہی تھیں انہوں نے ہاتھوں میں جو پیارے سنے لئے ہوئے تھے، آگ کی روشنی میں میں نے

ویکھا وہ آدمیوں کی کھوڑ پر یاں تھیں۔
میں سر سے پاؤں تک کانپ گئی اور بچھر شاید مجھے ہوش خدا۔
جب میری آنکھ کھلی تو میں اس دیوی کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی
اور بچھولوں کی محھڑی بندھی۔

وہ بہت ڈر لگا تھا؟ ” دیوی نے پوچھا۔
مجھے ایک بار بھروسہ آگ اور اس کے اردو گرد بھھڑے ہوئے وہ
لوگ یاد آگئے جن کے سر سماںوں کے سروں کی مانند تھے اور دھڑ آدمیوں
چیسے — میں بچھر کانپ اکھی۔
” دن کے اجالے میں تو انہیں کئی بار بکھرتی ہے، تو مجھے ڈر نہیں لگتا ”
وہ بیس لے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ ”

” دن کے اجالے میں یہ لوگ چہرے پر لقب ڈال لیتے ہیں ”
” وہ لقب ”

” آدمیوں کے مونہہ جیسے انہوں نے لقب بنار کھے ہیں، اپنے
سماں پٹما سروں کو ڈھانپنے کے لئے یہ ہمیشہ لقب پہنچ رہتے ہیں ”
” وہ توان میں ہر وقت زہر بھرا رہتا ہے ” میرا جسم جیسے برف کا
ٹکڑا ہو گیا ہو۔

” یہ سب ہی بیچارے میری بہن کے ڈسے ہوئے ہیں۔ ان کی رگ
رگ میں زہر بھرا ہوا ہے۔ ان میں سے کئی اس دنیا کے مشہور و معروف لوگ
ہیں ۔ ”

”دیوی! یہ کیا کام کرتے ہیں؟“

”یہ صرف ڈاکے ڈالتے ہیں، لاکھوں لوگوں کی محنت کا پھل ٹوٹ لیتے ہیں۔“

”اُن کے پاس بڑے ہتھیار ہوں گے۔“

”اپنے ہتھیاروں سے یہ بناتے کچھ نہیں۔ یہ صرف چھین لینا اور ماننا ہی جانتے ہیں۔“

”لیکن دیوی! اگر تمہاری بہن کبھی تمہیں ڈس لے جائے؟“

”وہ مجھے ڈس نہیں سکتی۔ وہ مجھے ہر طرح دکھ پہنچا سکتی ہے۔“

”شکر ہے کہ وہ تمہیں ڈس نہیں سکتی۔“

”میرے لباس میں جڑے ہوئے تاروں سے جو روشنی لکھتی ہے اُس سے اُس کی آنکھوں میں دھنڈ لکھا جانا ہے اور وہ میرے پاس نہیں آ سکتی۔ پھر میرے پیسے سے جو خوبیوں آتی ہے، سے وہ گھبرا جاتی ہے۔ اور مجھ سے دُور ہٹ جاتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ مجھے کب کی ڈس چکی ہوتی۔ جو حد اُسے مجھ سے ہے، وہ شاید دنیا کی کسی اور شے سے نہیں۔ اگرچہ وہ مجھے ڈس نہیں سکتی لیکن اُس نے مجھے ہر طرح دکھی بنا دیا ہے۔“

”میری دیوی!“

”حمدیاں گز گئیں، کہی حمدیاں — میں اپنے محبوب سے ملن نہیں سکتی۔“ دیوی کے چہرے پر رقت کے اثرات اپھر آئے۔ ”میرے محل کو آلنے والے سب ہی راستوں پر اس زہر ملی لڑکی نے زہر بکھر کھا ہے۔“

اپنے مجھے دلوی کے دکھ کا پہنچ لگا۔

”کسی بار میرا جو پر میرے پاس سے نکل جاتا ہے، تو زہر ملی لڑکی اپنا آپنے پر میرے پر میرے کے آگے پھیلا دیتی ہے اور وہ مجھے پہچان نہیں سکتا۔ صدر یاں گزر گئیں، کئی صدمہ یاں۔ اگر مجھے ہمیشہ جوان رہنے کی دعا ملی ہوتی تو نہ چاہئے میر کیا حال ہوتا۔ تو نے اپنی دنیا میں نہیں دیکھا کہ محبت کرنے والے کبھی منزل کو نہیں پا سکتے۔ میں جس سے پیار کریں ہوں مجھے تک وہ مجھے نہیں ملے گا، دنیا میں محبت کرنے والوں کو ان کی منزل نہیں ملے گی۔“ دلوی نے پھولوں کے نکے کا سہارا لیا، شاید اس کا دکھ بہت بڑھ گیا ہے۔

”میری دلوی!—“ میرے آنسوؤں سے میرا پھر بھیگ گیا دیکھ دیاں یوں ہی گزر جائیں گی؟“

”صرف ایک تدریج ہے!“

”کوئی تدبیر بتاؤ دلوی! تمہاری پوچا کرنے والے بھی بے شمار ہیں۔ کوئی تدبیر بتاؤ نہیں تو کسی دن وہ بھی ڈسے جائیں گے!“

”جب کوئی میرے گیت کا تائے، جہاں تک ان گیتوں کی آواز جاتی ہے وہاں تک۔ میری بہن کے زہر کا اثر نہیں ہوتا۔“

”تمہارے گیت! میری دلوی! تمہاری پوچا کرنے والے تمہارے گیتوں کو دنیا کے ہر کوئے میں بکھر دیں گے!“

”کسی بار بہت اپنے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ وہ میرے گیت لکھتے

ہیں۔ اور جب لوگ ان گینتوں کو پڑھتے ہیں، لوگوں کے راستوں میں پھولوں کے فض ہوتے ہیں۔ لیکن جب لوگ زہری یا ٹکری کے پیالے سے زہر کی بوندی پلی لیتے ہیں تو وہ میرے گیت گانے بند کر دیتے ہیں۔ اور جب لوگ میرے گینتوں کو بھول جاتے ہیں تو اس وقت میری بہن موت کا ناج ناچتی ہے۔ میری بہن انسالوں کی کھوڑپیوں میں زہر بھر بھر کر لوگوں کو پاٹی ہے، تو نشے میں مست ذہ لوگ آدمی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رنگ کر رہتے ہیں اور موت کا ناج ناچتے ہیں۔“

”پس لوگوں کے بیوں پر تمہارے گیت بچھیر دوں گی، بہت اچھے لوگوں نے تمہارے بہت اچھے گیت لکھے ہوں گے، میری دیوی! اگر مجھ سے اتنے اچھے گیت نہ بھی لکھے جاسکے، پھر بھی میں تمہارے گیت لکھوں گی۔“

”میرے گیت دل کے خون سے لکھنے پڑتے ہیں، میری پیاری!“

پس نے دیوی کے چہرے کی طرف دیکھا تو میری آنکھوں نے کہا۔

”تمہاری بات مجھے کسی بھی قیمت پر منظور ہے۔“

دیوی کے اس پھولوں والے محل میں ایک تالاب کنوں کے پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے کنارے کھڑی ہو کر ایک کھلے ہوئے نیل کمل کی طرف اُنگلی اٹھا کر اس نے کہا۔ ”اس میں دیکھو۔“

پس نے اس کا حکم سر انکھوں پر لیا اور نیل کمل کے کھلے ہوئے دل میں دیکھا۔

”کچھ دیکھائی دیا؟“

”ہاں دیوی! ایسا ایک چہرہ جو ساری عمر بھلا کیا نہ جاسکے؟“
 ”تو ساری عمر نہیں بھول سکے گی پسایری! ساری عمر نہیں بھول سکیگی؟“
 ”اس کنوں میں جو بھی جھانک کر دیکھتا ہے، کیا اسے یہی چہرہ
 دیکھانی دیتا ہے؟“

”نہیں پسایری! جس طرح پانی میں دیکھنے والے کو صرف اپنا منہہ
 ہی دیکھانی دیتا ہے۔ اسی طرح اس پھول میں ہر ایک کو اپنی منزل دیکھانی دیتی
 ہے اور ہر ایک کی منزل اپنی اپنی ہوتی ہے۔“

”اس پھول کو صرف نیل کمل ہی کہتے ہیں۔“

”نہیں، اس پھول کو تصور ریخیاں بھی کہتے ہیں۔“

”یہ چہرہ۔۔۔ میری منزل“ چیرت کے سامنے میں خوف کی
 پرچھائیں شامل ہو گئی اور میں دونوں میں گھرگھنی۔

”تمہاری آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے اس کا انتظار بس جائے گا۔
 اور اس کی یاد تمہارے دل میں جسب بھی ٹرپ پیدا کرے گی، تمہارے دل
 سے لہو بہ نکلے گا میرے گھبٹ اسی لہو کے پاکیزہ رنگ سے لکھے جاتے
 ہیں، میری پسایری!“

”میں اس چہرے کو کبھی نہیں دیکھو سکوں گی۔“ یہ پہلی سچی
 ٹرپ سچی جس سے میں کانپ اٹھی۔

”و نہیں پسایری! کبھی نہیں، نہ تو نہ کوئی اور اپنی منزل کا منہہ
 دیکھ سکتا ہے، ہمارے راستوں میں بددعا میں بچھی ہوئی ہیں۔ تو میری

طرف نہیں دیکھتی۔ صد میال گزر گئی ہیں، ”
میری آنکھوں میں سینکڑوں آنسو املا آئے اور میں نے اس
تاروں جرٹے آنچل کو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا، پھر شاید مجھے ہوش نہ رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو نہ وہ پھولوں کا محل تھا نہ وہ دلوی ہی
تھی۔ اپنی چار پانی کو میں نے ٹوٹا۔ میرے سر ہلانے وہی لمبپ اور وہی
خواب پڑی تھی۔

کسی برس گزر گئے ہیں، مجھے ابھی تک پتہ نہیں لگا کہ اُس رات
میں نے خواب دیکھا تھا یا اُس رات پر یوں کی کہانی جیسی یہ کہانی واقعی
پیش آئی تھی۔

نیل کمل میں دیکھا ہوا مکھڑا مجھے اسی طرح یاد ہے، میری آنکھیں
بھر بھر آتی ہیں۔ تڑپ برداشت نہیں کی جاتی اور میں اپنے قلم کو اپنے
دل کے پاکیزہ خون سے ترکر کے محبت کے گیت لکھنے پیچھے جاتی ہوں۔

دُھوال اور شاخ

ہر دلیو نے جب تہ بند آ کر تپلوں پہنی اور گلے میں نکٹائی پیٹ
 کر اسے گانٹھ دینے لگا تو اسے یہ محسوس ہوا جیسے سات دن پہلے کا
 ہر دلیو کوئی اور ہی سمجھا اور آج کا ہر دلیو وہ ہر دلیو نہیں۔ سات دن پہلے کا
 کے ہر دلیو کو اس نے گھبرا کر آواز دی "دلیو" دلیو کے نام سے اس
 نے اس لئے پکارا تھا کیونکہ ہفتہ بھر براہمی اس کو دلیو کہہ کر ہی پکارتی
 رہی تھی۔ پورا نام لینا اس کے لئے مشکل تھا۔
 "ہاں ہر دلیو۔" دلیو کی آواز آئی۔

"مجھ سے یوں جدا ہو جاؤ گے دوست!"
 "شاید ہونا ہی پڑے ہر دلیو! یوں بھی تو ہم ایک ہی
 دُنیا کے رہنئے والے نہیں معلوم ہوتے۔"

”بیوں میں کوئی ایسا غیر ہوں؟“
 ”غیر؟ ہاں غیر ہی تو کہہ سکتا ہوں۔ مجھ سے توبہ تم
 پہچانے بھی نہیں جاتے۔“

”لباس کی تبدیلی اتنا فرق ڈال سکتی ہے؟“
 ”نہیں ہر دلپو! محض لباس کی بات نہیں۔ تم ایک مصنف
 ہو اور مصنف بھی ایسے، جس کا نام ہزاروں انسانوں کی زبان
 پر ہے۔ اور میرا نام... میرا نام تو شاید بڑی کے سوا کوئی نہیں
 جانتا۔“

ہر دلپو کو اس بات کا دھکا سالگا۔ اُس کے جی میں آیا کہ
 کہہ دے ”دلپو... دلپو! میرے دوست! تم مجھ سے کہیں
 زیادہ خوش قسمت ہو، ہزاروں لوگ میرا نام لیتے ہیں۔ مگر مجھے بھی
 بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کوئی مجھے جانتا ہے۔ تمہارا نام کوئی نہیں
 جانتا، صرف ایک ہفتہ تک بہمی لئے ہی تمہیں تمہارے نام سے
 پیکارا اور تمہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ بہمی تمہیں جانتی ہے۔“
 مگر ہر دلپو نے کچھ نہیں کہا۔

”ہر دلپو! ایسی بھی کیا مایوسی! ہر جگہ تمہارے لئے پلکیں
 بچھائی جاتی ہیں، ہر کارج میں تمہیں عزت کی لگاہ سے دیکھا جاتا
 ہے۔ کل دھرممالہ گورنمنٹ کارج کی طرف سے تمہارا استقبال ہونے
 والا ہے۔ کتنے لڑکے اور لڑکیاں تمہارے گرد منڈلائیں گی، کتنے دلوں

میں تم سے دو باتیں کرنے کی تمنا ہوگی، کتنے لوگ آٹو گراف لیجئے
کے لئے تمہارے گرد جمیع ہو جائیں گے، کتنی ہی حینا میں جب اپنے
محبووں کو خط لکھیں گی تو تمہارے گیتوں کی زبان میں اپنے دل کی
باتیں کہیں گی۔ تمہیں شاید یاد نہیں رہا کہ ایک مرتبہ جب تم اپنی
سیٹ بک کرانے کے لئے کھڑکی پر پہنچے تو تمہارا نام سن کر مکنگ
کارک کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ پلیٹ فارم پر گھومتے ہوئے لوگوں نے
جب دُبے کے باہر تمہارا نام دیکھا تو تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لئے
تمہارے ڈبے کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔“

”پچھہ نہ کہو دیو! یہ سب ٹھیک ہی، مگر اس سے دل کی
خواں کو تو نہیں بھرا جاسکتا۔“

”پھر؟“

”تم بھی میرے ساتھ چلو، جہاں میں رہوں، وہیں میرے
ساتھ رہنا۔ مجھے اپنی مصروفیات سے جب بھی فرصت ملے گی، تم
سے باتیں ہوا کریں گی۔ میں تنہا بُوں، بالکل تنہا — ہزاروں انسانوں
کے ہجوم میں تنہا۔ میں تمہارے سامنے اپنا دل کھول کر کہ سکوں گا؛“

”مجھے تمہارا شہر، تمہاری تہذیب اور تمہارا تمدن برداشت
نہیں کر سکے گا۔ ہر دیو! تم کبھی ہندوستانی شاعری کی باتیں کرتے ہو،
کبھی انگریزی شاعری اور کبھی رومنی شاعری کی پاریکیاں بیان کرتے ہو،
تم انہیں مختلف ناموں سے پکارتے ہو۔ کبھی رومانی شاعری سمجھتے ہو کبھی

کبھی حقیقت پسندانہ یا اشاراتی اور کبھی ترقی پسند اور کبھی روائی۔ مجھے ان باتوں کا کچھ پتہ نہیں۔“

ہر دبلو نے سر جھکا لیا۔ بیتے دن اُسے یاد آگئے پرسوں سے اس کے اندر ایک آگ سی سُلگ رہی تھی، ایک دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ مگر مجھے کچھ چہیتوں سے اُس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ دھرممالہ کے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل نے اُسے دعوت دی تھی کہ وہ اُن کے کالج میں تین لیکھ رہے۔ ایک قدیم شاعری پر، دوسرا جدید ہندوستانی شاعری پر، اور تیسرا ہندوستانی شاعری کا دوسرے حمالک کی شاعری سے موازنہ۔ اس نے یہ دعوت قبول کر لی تھی۔

آٹھ دن تک وہ کتابوں کے مطالعے میں غرق رہا اور اس دوران میں اُس نے کتنے ہی مسودے تیار کر لئے تھے۔ پھر نپدرہ دن دن کی فرصت لٹکا کر وہ دہلی کے شور و غل سے نجات پانے کے لئے دھرممالہ کے گوشہ تہائی میں آپسیٹھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دس بارہ دن تہائی میں بیٹھ کر اپنے دل میں دفن افسالوں کو دہراتے، اپنے دل میں پھلنے والے جذبات کو گیتوں کا روپ دے اور پھر کالج میں تین لیکھ رہے کروالیں دہلی چلا جائے۔ یہ تھا اس کا پروگرام۔ لیکن دھرممالہ کے ہوٹل کی تہائی میں بھی اُس کو وہ سکون

پیش رہ ہوا جس کی تلاش میں وہ بیہاں آیا تھا۔ اس نے اپ وہ روزانہ صبح کو کسی بس میں سوار ہو جانا اور جہاں جی چاہتا اُتر جانا۔ اس کے ساتھ صرف ایک چھوٹا سا سفیلہ ہوتا۔ جس میں وہ ایک ڈبل روٹی، مکھن، انڈے اور کچھ پھل رکھ لیتا، سفر میں چائے ہوتی، سگریٹ کی دو ڈبیاں جیب میں ڈال لیتا۔ کھدر کی ایک پتلی چادر اور ہواں تکیہ کو نہ کر کے سفیلے میں رکھ لیتا۔ جہاں جی چاہتا گھومتا، جہاں جی میں آتا اپنی نیلی چادر پھیلایا کرتکیہ میں ہوا بھر کر لیٹ جاتا۔ اس طرح دن گزارتا شام کے وقت کسی گاؤں کے نزدیک پہنچ جاتا اور کسی گزرتی ہوئی بس میں سوار ہو کر رات کے تک اپنے ہوٹل میں لوٹ آتا۔ اس طرح کوئی تین دن گزرے سختے اور چونکہ دن جب وہ سارا دن ایک گاؤں کے لہلہتا تے کھیتوں میں گزار کر والپس لوٹنے ہی والا تھا۔ اچانک ایک پتھر پر سے اُس کا پاؤں کچھ اس طرح پھلا کہ منجلتے منجلتے بھی موچ آگئی اور دیکھتے دیکھتے اُس کی اڑی مسروج گئی۔ وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ جہاں پہنچا تھا وہیں پیٹھا رہ گیا۔ سائے ڈھل چکے سختے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اُس کے پاؤں میں آگے بڑھنے کی سکت نہ تھی۔

اب وہ کسی راگیر کا انتظار کرنے لگا۔ اندھیرا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف سے کچھ آہٹ سنائی دی۔ بالنس کے پڑ کے پاس ایک لڑکی پتے توڑ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا اس لڑکی کی بجائے اگر کوئی مرد ہوتا تو اس سے مدد مانگتا۔ اس کے سہارے کچھ دور پیل لیتا۔ لڑکی نے پتوں

کا گھٹڑ پاندھ لیا اور سر پر رکھ کر چل دی۔ جب اُس کے پاس سے ہو کر گزی تو کہنے لگی۔ ”کیوں بابو اپنے سچوں گئے ہو کیا؟“

اگرچہ لڑکی کی زبان پہاڑی تھی۔ مگر اس کے سمجھنے میں چند اس دشواری نہ ہوئی۔ ہر دیو نے اُس کو بتانے کی کوشش کی کہ اُس کے پاؤں میں چوتھا آگئی ہے اور وہ چل نہیں سکتا۔ پھر اُس سے کہا کہ وہ گاؤں پہنچ کر کسی آدمی کو بجھج دے، جس کے کندھے کا سہارا لیکر وہ گاؤں تک پہنچ سکے۔ لڑکی نے پتوں کا گھٹڑ زمین پر رکھ دیا اور ہر دیو کے تھیلے کو اپنے پانی کے بتن پر لٹکا کر اُس سے بولی کہ وہ اُس کے کندھے کا سہارا لیئے کی کوشش کرے۔ کوئی تزویہ شخص بھی ہوتا تو ہر دیو اُس کے سہارے اتنی آسانی سے نہ چل سکتا تھا جتنا کہ وہ اس دشیزہ کے کندھے پر چھپی رکھ کر چل رہا تھا۔ ہر قدم پر اسے اس بات کا خیال رہتا کہ کہیں وہ زیادہ دباؤ نہ ڈالے اور دل ہی دل میں اپنے لفڑا لئے پاؤں سے جیسے عرض کرتا جا رہا ہو۔ — کچھ تو صبر سے کام لے۔

جب ہر دیو گاؤں کی حدود میں داخل ہوا تو انہیں ہیرا کافی گھرا ہو چکا تھا، لڑکی اُسے اپنے گھر لے گئی۔

”میں تمہیں کیا کہہ کر لپکاروں؟“ ہر دیو نے پوچھا۔

”میرا نام برمی ہے بابو!“

”تم مجھے بابو کیوں کہتی ہو؟ میرا نام تو ہر دیو ہے：“

”تمہارا نام پڑا مشکل ہے بابو۔“

”مشکل ہے تو آسان بناؤ۔ کہو تو سچلا دیو۔“

”دیو۔“ برمی نے آسانی سے کہ دیا۔

”برہمی! اس گاؤں میں کوئی سرائے تو ہوگی یا پھر کوئی مندر میں دیہیں پڑا رہوں گا۔“

برہمی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کو دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا کر کے اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد برہمی کے باپ نے آکر ہر دیو کا بازوں سخاں لیا۔

”کوئی فکر نہ کرو بابو! برات میں یہیں سُھیر جاؤ، تمہارا پاؤں سینک دیں گے۔ کل تک سٹھیک ہو جاؤ گے۔“

وہ ”کل“ جلدی نہ آئی۔ ہر دیو کی پاؤں کی سُوجن کوئی تین دن تک رہی۔ برہمی کا باپ روزانہ اس کے پاؤں پر گرم تیل کی مالش کرتا اور پھر کس کر باندھ دیتا۔ اس دوران میں ہر دیو کو یہ خیال بھی ہوا کہ وہ کسی بس والے کے ہاتھ رقصہ بھیج کر پہنچنے ہو ٹھیں میں خبر دے اور کسی ڈاکٹر کو بلوا لے یا ہو ٹھیں سے کچھ ضروری چیزیں ہی منگوںے مگر پھر سوچا کہ ایسا کرنا برہمی کے جذبہ خدمت کو سمجھیں پہنچانے کے متراودت ہو گا۔ وہ جس چارپائی پر پڑا سخا وہیں پڑا رہا۔

اپنی نیلی چادر کا اس نے تمہد بنالیا تھا۔ برہمی روزانہ اس کی قیفیں دھو دیا کرتی تھی۔ خالص اون کے روپ پر برہمی کے باپ نے اس کی چارپائی پر بچھا دئے تھے۔ برہمی کی نال اس کے لئے چاؤں ایا تی

تھی، دال پکا تی سخنی اور پیٹھے کی سبزی تیار کرتی تھی۔ پھر بھی بڑہی کو جیسے کوئی کمی محسوس ہوتی۔ وہ پڑوسیوں سے دھان اور مکی کے بدلتے چھوڑا ساگر ہوں کا آٹا بھی لے آئی تھی۔ اور اس کے لئے بلکہ پہلکی چپا تیاں سینکنے کا اہتمام کرتی۔

چوتھے روز ہر دیو کے پاؤں میں اتنی سکت آگئی کہ وہ چار پانی سے اٹھ کر بڑہی کے چوڑھے کے قریب بیٹھنے لگا۔ گیلی لکڑیاں بار بار ہوا چھوڑتیں، ہر دیو لکڑیوں کو پھونکوں سے سُلگانے کی کوشش کرتا اور بڑہی چپا تیاں بیلتی جاتی۔

دیوالی قریب آ رہی تھی۔ بڑہی کی ماں اپنے کچھے مکان کی لپائی کرنے کے لئے تمام چیزیں ہتھیا کر چکی تھی۔ ہر دیو کو پہلی بار پانی میں بھیگ ہوئی مٹی کی سوندھی سوندھی شکنڈھا اتنی بھلی معلوم ہوئی کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس خوشبو کے آگے دنیا کی تمام خوشبوں میں پیچ ہوں۔ آنکن کی لپائی کرتے وقت بڑہی کی ماں گیر وارنگ گھول کر ساے آنکن میں پاؤں کے نشان بنانے لگی تو اس نے پوچھا

”یہ کیا بڑہی؟“

”ماں کہتنی ہے کہ یہاں پاؤں رکھ کر چھپی آئے گی۔“ بڑہی نے اسے بتایا۔

ہر دیو کے دل میں اس کے اس معصوم اعتقاد کے لئے تعظیم کے جذبات اپھر آئے۔ اس نے ہنس کر پوچھا:-

”پچ بزمی! لکشمی آئیگی تو مجھے دکھاؤ گی؟“
 ”واہ! پچ بزمی کبھی کبھی دکھائی دیتی ہے۔“ برمی ہنس کر بولی۔
 ”کبھی کبھی تو دکھائی دے ہی جاتی ہے۔“
 ”و کب؟“

”جب وہ دکھائی دیتی ہے تو اُس کا نام پدل جاتا ہے۔“
 برمی اُس کا منہ تکنی رہ گئی۔
 ”و کبھی کبھی اُس کا نام برمی بھی ہو جاتا ہے۔“ ہر دیوں نے کہا۔
 برمی کے چہرے پر جیا کی سُرخی دور گئی۔ اس کا چہرہ تمباٹھا۔
 ہر دیو کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اگرچہ اسے دنیا بھر کے مشہور مصوروں
 کے شاہکار دیکھنے کے موافق حاصل ہوئے تھے۔ مگر ایسا پاک حُسن
 اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

برمی کے باپ نے اپنے ”بابو“ کی خاطر مدارت کے لئے ایک
 دن شہر سے ڈبل روٹی اور انڈے منگوائے۔ ہر دیو گولاکھ کہتا رہا کہ
 اب اسے مکی کی روٹی اور انڈے چاولوں کے سوا اور کچھ اچھا نہیں لگتا مگر
 برمی اور اُس کے جھروالوں کو ہمہان نوازی میں ابھی کچھ کسر معلوم ہوئی
 تھی۔

برمی نے آگ جلانی۔ ہر دیو نے توار کھکھ کر برمی کو انڈے ملنے
 کا طریقہ بتایا۔ برمی چائے تیار کر رہی تھی۔ لکڑیاں بجھ بجھ جاتی تھیں
 ہر دیو نے کتنی ہی سچھونکیں ماریں۔ مگر لکڑیوں نے آگ نہیں کپڑا۔

برہمی نے زور سے ایک پھونک ماری تو دھوئیں کے پادلوں میں سے ایک شعلہ لپکا۔ چوڑھے پر جھکی ہوئی برہمی کا چہرہ منور ہو گیا۔
ہر دلیو کو پہلی بار یوں لگا کہ برسوں سے اُس کے دل میں جو آگ مُلگ رہی تھی اور وہ ہواں گھٹ رہا تھا آج اُس میں کسی نے ایسی پھونک مار دی کہ وہ روشن ہو گئی۔ ایک شعلہ لپکا۔ جس کی روشنی میں برہمی کا چہرہ منور ہوا۔ اُس کے لئے برہمی اب محض ایک رُڑکی نہیں تھی۔ انسان کی پاک محبت کی زندہ جاوید تصویر تھی اگلے دن برہمی نے ایک عجیب بات کی۔ اچانک وہ ہر دلیو سے مخاطب ہو کر لوی۔

”دلیو پابو! تم نے کہا تھا ناکہ لچھمی جب دکھائی دیتی ہے تو اس کا نام بدل جاتا ہے۔“
”وہ ہاں!“

”وہ کیا لچھمی کبھی کبھی مرد بھی بن جاتی ہے؟“
یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہر دلیو لا جواب ہو گیا تھا۔ وہ برہمی کامنہ تک تارہ گیا۔

ہر دلیو کے ہواں تکیہ میں برہمی بڑے شوق سے مُٹھے لگائے ہوا بھرتی تھی۔ جب وہ بھر جاتا تھا تو ہر دلیو اس کے ساتھ اپنا چہرہ یوں لگا دیتا جیسے اُس میں سے برہمی کی سائیں آ رہی ہوں۔

انہیں خیالوں میں غلطائے ہر دیو نے سراٹھا یا۔ دیو اُس کے پاس کھڑا تھا۔ ہر دیو نے گرم سلیٹی پکلوں پہن رکھی تھی اور دیو نے اپنی کمر کے گرد نیلی شہمد۔

” دیو !“

” ہاں دوست !“

” تم میرے ساتھ نہیں چلو گے ؟“

” میرے لئے اور کوئی جگہ نہیں رہی ہر دیو، میں یہاں ہونگا“

” یہاں پر بھی کے کھڑا ؟“

” میں کسی اور کو دکھانی سخوری دوں گا جو مجھے غم ہو۔“

” تم یہاں کیا کرو گے ؟“

” پر بھی جنگل میں پختے پر اکیلی پانی بھرنے جانی ہے۔ میں اُس کے ساتھ جایا کروں گا۔ وہ کھینتوں میں چاکر دھان کاٹتی ہے میں اُس کا گھٹھاٹھوا یا کروں گا۔ وہ چوڑھے کے سامنے روٹیاں پکاتی ہے میں آگ سلا گایا کروں گا۔“

” وہ کچھ عرضے کے بعد جب اپنی سُسرال چلی جائے گی پھر ؟“

” میں اُس کی ڈولی کے ساتھ ساتھ جاؤں گا۔ وہ اپنا گھر بسائے گی تو میں اُسے آرائش کروں گا، سجادوں کا۔“

” مگر دیو تمہارا اُس کے ساتھ رشتہ کیا ہوگا ؟“

”بھی تو دنیا والوں کی بُری عادت ہے کہ وہ ہر انسان کا دُوسرے انسان سے رشته جاننا چاہتے ہیں۔ وہ انسان کو بعد میں دیکھتے ہیں اور رشته پہلے کیا عورت کا چہرہ عورت کا چہرہ نہیں ہوتا ہے کیا وہ ضرور ماں کا چہرہ ہونا چاہیئے ہے بہن کا چہرہ ہونا چاہیئے ہے بیٹی کا چہرہ ہونا چاہیئے ہے بیوی کا چہرہ ہونا چاہیئے ہے صرف عورت کا چہرہ کیوں نہیں رہ سکتا؟“

”تم طہیک کہتے ہو دیو! میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں“

”کم از کم تمہیں تو یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیئے“

”میں کچھ نہیں پوچھتا۔“

”آج تم نے اپنے ہوائی تیکے کو خالی نہیں کیا ہر دیو؟“

”اس کو برہمی نے اپنی سالنوں سے بھرا ہوا ہے“

”تو پھر؟“

”جب تک ممکن ہوگا اس کی سالنوں سے ملاکر سانس لوزگا۔“

”مگر کتنے دن ہر دیو بہتری دنیا کی ہوا اس دنیا سے مختلف ہے۔ وہ تہذیب و تحدن کی دنیا ہے۔ اس میں ہرگھڑی نفرت اور جنگ کے جراثیم پروش پاتے ہیں۔ اور یہ تہذیب اور تحدن کی دوڑ میں پیچھے چلنے والی دنیا ہے۔ اس میں مونخ اور گئی کے خوشے سانس لیتے ہیں تیری دنیا کی فضاؤں میں تو برہمی کا دم گھٹ کر رہ جائے گا۔“

ہر دیو نے کچھ جواب نہ دیا۔ تیکے کا پیچ کھول دیا۔

ایک لمبے میں بڑھی کی سالنیں ہر دیوکی سالنوں سے
آزاد ہو گئیں اور موسم اور ملکی کے کھیتوں سے آلنے والی ہوا میں
تحلیل ہو گئیں۔

ملاقات

چکچیت جب آئینہ کے سامنے آئی تو اُس کی پشت کی طرف اُس کے دراز اور گھنے پالوں کی گھٹاسی اُڑ آئی تھی۔ اُس نے اپنے دلوں ہاتھوں سے اپنی دراز زلفوں کو یوں پکڑا جیسے ان اُڑی گھٹاؤں کو جلد از جلد سمیٹ لینا چاہتی ہو۔
”خبر سنی؟“ ایک آوازنے اُس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

”—“ چکچیت خاموش رہی۔

”وہ اسی شہر میں آیا ہے؟“

چکچیت اب بھی چپ رہی۔

”پیغام ملا؟“

”پیغام لفظوں کا محتاج نہیں“

”ملوگی؟“

”معلوم نہیں“

”رات بھر بے چین رہی ہو“

”یہ کوئی نئی بات نہیں... ایسی راتیں کئی ہوتی ہیں۔“

”مگر کبھی کبھی کوئی سوئی ہوئی چنگاری کو پھونک مار کر جگا ہی دیتا

”ہے؟“

”اور روشنی تیز ہو جاتی ہے۔“

”حیاتِ تنکوں کے ظہور کی ترتیب کا نام ہے...“

”اگر سلگتے رہنا ہی میرے خصیب میں ہو...“

”کیا زندگی کے چشموں میں پانی نہیں رہا؟“

”زندگی کے چشموں میں نہیں۔ مگر رازِ پلکوں کی جھیلوں میں

”بہت پانی ہے۔“

”لبٹ کیں پاسکیں گے؟“

”یہ لفظ تو کبھی نہیں سُنا میں لے۔“

”تمہیں اس سو ملتا ہو گا جگہت۔“

”تم سچوں رہی ہو کہ اب میں آزاد نہیں ہوں۔“

”یاد ہے۔“

”اور پھر اسے دینے کے لئے میرے پاس رکھا بھی کیا ہے؟“

ایک اقرار بھی تو نہیں۔“
”میں سمجھتی ہوں۔“
”پھر؟“

”جس ”محبوبہ“ نے تمہارے دل میں جنم لیا تھا۔ کیا ”بیوی“
اور ”ماں“ کے دول فقط اس کی آنکھیں پنڈ کر سکیں گے ہے؟“
”نہ بھی کر سکیں تو بھی اس کی آنکھوں کے سامنے ایک لاتنا ہی
اندھیرا ہے۔“

”مگر اس کی سانیں برقرار ہیں اور دل پے قرار“
”پھر تم ہی کہو کہ کیا کروں؟“

”تمہیں وہ کیسی لگتی ہے، تمہارے اندر کی ”محبوبہ؟“
”کبھی کبھی اس کی گرم آہوں کی میں تاب نہیں لاسکتی۔
یہاں تک کہ میرے اندر جو ”بیوی“ اور ”ماں“ ہیں وہ بھی خوفزدہ
ہو جاتی ہیں۔“

”بیوی زندہ رہے، ماں بھی زندہ رہے، کیا اس کو جینے کا
کوئی حق نہیں؟“

”تمہیں کہوا سے کہاں رکھوں؟ میری تنگ دامانی کو تو دیکھو“

”دھرتی بہت وسیع ہے۔“

”مگر دھرتی پر محبت کے دو قدموں کے لئے کوئی بھی جگہ نہیں۔
کچھ دیر خدا موشی رہی۔“

”جواب نہیں دیا تم نے؟“ جگہت لئے پوچھا۔

”جواب تمہارے اندر ہے جیتنی“

”مجھے تو بہت آواز بولنے کی آزادی نہیں۔“

”بایہا...“

”تمہیں مجھ پر ہنسنا نہیں چاہیے“

”اچھا میرے آنسو تمہیں تسلیم دے سکیں گے؟“

”آنسو کب تسلیم دیتے ہیں۔ میں برسوں روکر دیکھ پڑا ہوں“

”اس سے بلنا ہوگا جگہت۔“

”جب وہ میری طرف دیکھتا ہے، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے

کہ کوئی میرے زخم کو ناخن سے کرپڑ رہا ہو۔“

”تم چاہتی ہو کہ زخم مندل ہو جائے؟“

”زخم لگانا اور اسے مندل کرنا اپنے اختیار کی بات نہیں۔“

”پھر؟“

”درو اتنا نہ ہو کہ برداشت نہ کر سکوں۔“

”ضبط کی چادر تان کر تمہیں نیت د آجائے گی۔“

”آنکھیں ڈھانپ لوں گی۔ یہ کون جانے گا کہ نیند آئی کہ نہیں۔“

”سوال تشریفہ جائے گا جگہت۔“

”مگر میسری وفا...؟“

”وفا...؟ وفا کوئی اٹھنی نہیں۔ یہ تو من کی حالت

ہوتی ہے۔ اسے اور ٹھا اور آتا را نہیں جا سکتا....“

”مگر....“

”دُنیا کی تہمت بھی تو دھول ہوتی ہے جیتی... اور اس کی بخشی ہوئی شہرت بھی۔ جب من کے سر و در میں نہالیا جائے تو جسم سے یہ دونوں دھولیں دھل جاتی ہیں۔ سوال ایک ہی ہے جیتی کہ من کا سر و در نہ مل ہو....!“

”اب تمہیں کہو کہ...“

”تم ہی نے تو کہا سختا کہ پیغام لفظوں کا محتاج نہیں۔“

”ہاں!“

”کس بر تے پر کہا سختا؟“

”یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب اس کے اور میرے درمیان لفظوں کی بھی گنجائش نہیں رہی۔“
نقریٰ تھے گوئی خ گئے۔

”یہ نہنسنے کی بات نہیں!“

”یہ بھی نہنسنے کی بات نہیں جیتی، تو اور کیا ہے۔ تمہارے اور اس کے درمیان دو لفظوں کا بھی گزر نہیں...“ پھر تم نے اس کے اور پسندیدن یہ دیوار فرقہ کیسے کھڑی کر لی ہے؟“

”یہ دیوار میرے قدموں کے لئے ہے۔ مگر میرے اندر کچھ ”باد“ جیسا آزاد و بے قرار ہے۔ جو ہر حد اور دیوار کو سچلانگ جاتا ہے۔“

” تمہاری روح کا یہ حصہ جو حدود کو خاتمیں نہیں لتا
وہ تمہیں کیسا لگتا ہے، اچھا یا بُرا؟ ”
” اس سے زیادہ پاک پورٹر کسی اور چیز کا مجھے کبھی احساس
نہیں ہوا۔ یوں محسوس ہوتا ہے وہی دراصل ”میں خود“ ہوں۔ باقی
سب میں ”میں“ نہیں۔ یا یہ ”میں“ بہت سے حصتوں میں پڑ
گیا ہے۔ ”

” یہ ”میں“ ایک خوشبو ہوتی ہے جگجیت! اس کے حصے
بخرے نہیں کئے جاسکتے۔ ”
” خوشبو آزاد ہوتی ہے۔ اور میں — میں آزاد نہیں۔ ”
” میں، اگر ہوتی ہے تو آزاد ہوتی ہے، ورنہ ہوتی ہی نہیں
اُس کی درمیانی حالت کا کوئی وجود نہیں۔ ”
” تو کیا اس ”میں“ کو زندہ رکھنے کے لئے میرے قدموں
کو شکست ہوگی؟ ”

” تم اس کو شکست کیوں کہتی ہو؟ ”
” شکست میں نے شاید ٹھیک نہیں کہا۔ صندوق مول
کی نہیں۔ میرے قدموں کے گرد گھیرا ڈالنے والے اھموں کی ہے۔ ”
” اھموں کی رسائی قدموں تک ہے، خیالوں تک
کیوں نہیں؟ ”
” شاید اس لئے کہ قدم دیکھائی دیتے ہیں، خیال نہیں۔ ”

”تو کیا اصول ان چیزوں کے لئے بنے ہیں جو دکھائی دیں؟
بچگجیت لا جواب ہو گئی۔

”درات کی تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ قدم اُس وقت بھی
ہوتے ہیں، اصول اس وقت بھی ہوتے ہیں... ثم اُس وقت
اپنے اصول کو قدموں سے علیحدہ کر سکتی ہو؟“
”و نہیں“

”پھر خیال کیوں نہیں اصولوں کی گرفت میں آئے...
قدموں اور خبیالوں میں آخر فرق ہی کیا ہے؟“

”شاید کچھ نہیں۔ اگر خیالوں کو بھی اصولوں کی بڑیاں ڈال
دؤں، میرا سب کچھ قیدی ہو جائے گا... شاید مر جائے گا۔“

”پھر نامعلوم تمہارا قدموں کے بندھنوں میں اس قدر لقین
کیوں ہے؟“

”میں خود نہیں جانتی۔“

”بندھنوں میں تمہیں کوئی یقین نہیں جنتی! یہ کبھی
کسی کو نہیں ہوا۔ اصول قدموں کے لئے سہارا بنے سکتے... تاکہ
قدم را گذار کے کانٹوں سے محفوظ رہیں۔ قدم منزل کی طرف بڑھتے
چلے جائیں۔ اور اصول ان کے محافظت بنیں... مگر دنیا والوں نے
اصولوں کو پاپوش سمجھا اور چلنا ہی بھول گئے... وہ بچپن کی
اس جوتی کو ہی پہننے رہے۔ بدلتے کی ہمت نہیں۔ اور پاؤں شکنخے

میں آگئے ریہاں تک کہ چلنے کے انداز ہی بھول گئے۔ خیالوں کے بھی اصول ہوتے ہیں جگجیت۔ وہ خیالوں کی رہنمائی کرتے ہیں... جب پاؤں بغاوت پر آمادہ ہوں، کہانہ مانیں۔ اُس وقت تو دولستے رہ جاتے ہیں۔ یا تو سب رہنمائیں چھوڑ کر خیال بھٹکنے لگتے ہیں، اور یا اصول پڑیاں بن جاتے ہیں۔

”میرے ہاتھ تھام لو... ان کو سہارا دو“

”کیا کرو گی؟“

”چلوں گی“

”اُس سے ملوں گی نہ؟“

”ہاں!“

”لیکن ان را ہوں پر سہارے نہیں ہوتے۔ جگجیت! صرف قدموں کی ہمت تمہیں لے جائے گی“

جگجیت نے نظریں جھکا کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ اُس کے پاؤں اصولوں کی ایک تنگ جوئی کی گرفت میں سختے۔

”میں کس طرح اُتاروں انہیں؟“

جواب کوئی نہ ملا۔

”کیسے اُتاروں انہیں؟“ جگجیت نے ہڑپ کر لپوچھا۔

جواب اب بھی نہیں آیا۔

جگجیت نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

اُس کے مَل منے ایک قد آدم آئینہ تھا۔ اور آئینے میں اُس کا اپنا
عکس ایک سوال کی صورت میں کھڑا تھا.... اُس کی پُشت پر کالے
سیاہ بالوں کی گھٹاسی اُمڈ آئی تھی۔ خبیاں کی گھٹا۔ اور اس
کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اس گھٹا کو سمیٹ لیں۔

پانچ بہنیں

ایک بڑے ملک کا قصہ ہے کہ ایک دن ٹھنڈے پلوری پانیوں نے زندگی کے خوبصورت اعضا کو مل مل کر دھویا۔ پھلوں نے جی بھر کر خوشبو لگائی اور سات رنگوں نے زندگی کے لئے ایک پوشاک پیش کی۔ سورج نے اپنی کرزوں کی وحاظت سے پھلوں میں رس پکایا۔ زندگی نے اپنی آنکھوں میں تسلیم چھلکا کر ہوا سے یوں کہا ”میں نے سنا ہے کہ اس صدمی کی پانچ رنگیاں ہیں۔ جوان اور خوبصورت ...“

”ہاں !“

”آج میں ان کے ہاں جاؤں گی“

ہوا نہنے لگی۔

”میرے پاس پانچ سو غایتیں ہیں۔ ایک سی قیمتی۔ میں ان سب کو ایک ایک سو غات دوں گی۔ کیا تم میرے ساتھ چلوگی؟“ زندگی لئے ہوا سے پوچھا۔

”جیسے تم کہو؟“

”سب سے پہلے میں پانچ بہنوں میں سب سے بڑی کے مگر جاؤں گی۔“

”اچھا، مگر اس کے گھر میں دروازے اور کھڑکیاں بالکل نہیں۔ صرف ایک دروازہ ہے۔ جب اُس کا خاوند گھر سے جاتا ہے تو جانتے ہوئے دروازے کو لوٹھے کا قفل لگا دیتا ہے۔ واپسی پر وہی قفل باہر سے کھول کر اندر لگا دیتا ہے۔“

”تم مجھے اپنے اندر سموں۔ خوشبوکی طرح۔ اس طرح میں تمہارے ساتھ اس کے گھر میں چلی جاؤں گی۔“

”نہیں، نہیں، خوشبوؤں سے میں بوجھل ہو جاتی ہوں۔ لہذا میں کسی جھری سے بھی مکان میں داخل نہیں ہو سکتی۔ جتنی دیواریں دیواریں پھلانگ کر میں اُس کے گھر پہنچتی ہوں، میرے جسم کا ایک ایک عضو چور چور ہو جاتا ہے۔“

ہوا زندگی کو پانچ بہنوں میں سب سے بڑی کے گھر لے گئی۔ اس بڑی دیوار پر بہت سی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ بینکاروں

تصویریں... ہزاروں تصویریں۔ زندگی لئے حیران ہو کر لوچھا۔

” یہ دیوار صدیوں سے بنی ہوئی ہے۔ جب اس گھر کی کوئی عورت ان دلہیزوں کو عبور کئے بغیر مرحافتی ہے تو اس ملک کے لوگ اس عورت کی تصویر اس دیوار پر بنادیتے ہیں۔“

” اس گھر کی کوئی عورت ان دلہیزوں کو عبور نہیں کرتی۔“

” نہیں زندگی..... کبھی نہیں۔“

” ان دیواروں کا کیا نام ہے؟“

” روایاتِ اکوئی خاندان کی روایت ہے، کوئی مذہب کی اور کوئی سماج کی...“

” مگر میں اس گھر کی عورت کو ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں۔“

” سورج کی کرنوں نے بھی اس گھر کی عورت کو نہیں دیکھا تھم بھلا کیسے دیکھ سکتی ہو؟“

” لیکن یہ بیسویں صدی ہے۔ اے ہوا! تم کون سی صدی کی پاتیں کر رہی ہو؟“

” یہاں صدیاں گھر کے باہر سے ہی گزر جاتی ہیں۔ دس صدیاں ادھر ہوں یا ادھر۔ اس گھر میں بنتے والوں کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

” میں اس کے لئے ایک سو غات لائی تھی۔“

” تمہاری سو غات اگر اس کے پاس پہنچ بھی جائے تو وہ

اُسے ہاتھ نہیں لگائے گی۔“

”کیوں؟“

”کیوں کہ دنیا کی ہر شے اس کے لئے ممنوع ہے۔“

”کیا وہ میری آواز نہیں مٹنے گی؟“

”نہیں، اُس کے کانوں کے لئے اس دیوار کے باہر سے

آنے والی ہر آواز کی مخالفت ہے۔“

”اے ہوا! تم کیا باتیں کر رہی ہو؟ آخر وہ جوان ہے۔“

”اے زندگی! تم برسوں کا حساب لگا رہی ہوگی۔ اس گھر کی عورت کبھی جوان نہیں ہوتی۔ بچپن پر رہی اس پر بیری کے نشانات ہو یا ہو جاتے ہیں۔“

زندگی کے پاؤں میں ایک لرزش اٹھی۔ وہ شکست خوردہ اور سمجھی سمجھی آگے چلنے لگی۔

”یہ اس صدی کی دوسری لڑکی ہے۔“ ہوانے کہا

”کون سی؟“

”وہ جو سامنے ریلوے لائن سے کوئلے چین رہی ہے۔“

ایک تیس سالہ عورت نے بائیں ہاتھ سے اپنی کمر پر

پھٹی ہوئی قمیض کو دوپٹے سے ڈھانپا اور دوائیں ہاتھ سے اپنی ٹوکری

میں ایک مسٹھی بھر کو ملہ ڈالتے ہوئے کوئی دس گز کے فاصلے پر زمین پر لیٹی ہوئی اپنی پچھی کو جھانکا۔ پچھی کے روئے کی آواز اب تیز ہو گئی تھی اس عورت نے ٹوکری ایک طرف رکھدی اور اپنی پچھی کو اپنی جھوٹی میں ڈال لیا۔ لڑکی نے ماں کی چھاتی کو کسی بار مونہہ مارا لیکن اُسے دودھ نہ مل سکا۔ اب وہ اور زور سے روئے لگی۔

زندگی نے قریب جا کر آواز دی ”بہن !“

اس عورت نے نہ جانے آواز سنی یا انہیں۔

زندگی نے اور نزدیک ہو کر پھر کہا ”بہن“

اس عورت نے بیگانہ لگا ہوں سے ایک بار دیکھا اور پھر اپنا دھیان دوسرا جانب پلٹ لیا۔ جیسے اُس نے سوچا ہو کہ آوازیں کسی اور کو دی جا رہی ہیں۔

زندگی کے ہوتے چیسے تڑپ گئے ”میری بہن“

عورت نے پھر اُس کی طرف دیکھا اور پہلے گانگی سے پوچھا۔

”تم کون ہو؟“

”مجھے زندگی کہتے ہیں“

عورت نے پھر اپنی توجہ اپنی روئی ہوئی پچھی کی جانب مبذول کر لی۔ جیسے راگہروں کی باتوں سے اُس کا کیا تعلق ہے؟ ”بیس تیرے دیس آئی ہوں، تیرے شہر، تیرے گھر“ دیس، شہر اور گھروالی بات جیسے اُس عورت کی سمجھ سے بالا تھی۔

”آج میں تیرے گھر رہوں گی“

عورت نے غصہ سے زندگی کی طرف دیکھا۔ جیسے زندگی کا اس سے اس طرح مذاق کرنا واجب نہ تھا۔

”تم لڑکی کو دودھ کیوں نہیں دیتی ہو۔ پچاری رو رہی ہے“

عورت نے ایک بار اپنے سوکھے ہوئے جسم کی طرف دیکھا۔ پھر روتی ہوئی لڑکی کے چہرے کو۔ تاہم اُسے اس سوال کا مطلب کچھ سمجھنا آیا۔ اگر اس کے پاس دودھ ہوتا تو کیا وہ بچی کو نہ پلاتی۔

”تمہرے سارے گھر کتنی دور ہے؟“

”اس گندے نالے کے پار“

”میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”مگر وہاں گھر کوئی نہیں، ایک سرکنڈوں کا چھپر ہے۔“

”تیسرا خاوند...؟“

”وہ بیمار ہے؟“

”کیا کام کرتا ہے؟“

”کارخانے میں مزدور تھا۔ پچھلے سال کی تخفیف میں وہ لفڑی سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔“

”اوہ پھر؟“

”ایک سال سے اُسے بُخار آرہا ہے۔“

”کیا یہ ایک ہی تمہاری بچی ہے؟“

”میرا ایک لڑکا بھی ہے مگر...“

”وہ کہاں ہے؟“

”ایک دن وہ بھوکا تھا، بہت بھوکا۔ اُس نے ایک میر آدمی کی موڑ سے سبب چڑایا تھا۔ پولیس والوں نے اُسے جیل میں ڈال دیا۔“

”میں تیرے گھر پلوں؟“

”مگر تم کون ہو؟“

”مجھے زندگی کہتے ہیں۔“

”میں نے کبھی تمہارا نام نہیں سننا۔“

”کبھی... کبھی پچین میں... پچین میں تم نے ضرور

کہا نیاں سنی ہوں گی۔“

”میری ماں کو بہت سی کہانیاں یاد رکھیں۔ میرا باپ کسان تھا، مگر وہ تھا ان کسانوں میں جن کی اپنی زبان نہیں تھی میری بڑی بہن کی شادی پر حکم نے قرضہ لیا جو ہم لوٹانہ سکے۔ ساہو کار نے ہمارے ڈنگر ڈھور چین لئے تھے۔ میرا باپ بہت دور کہیں پرولیس میں روزی کما نے چل دیا۔ میری ماں رات کو سونہیں سکتی تھی۔ وہ رات کو مجھے جگا کر کہا نیاں سننا یا کرتی تھی۔ بھوتوں کی جھوٹی کی... مگر میں نے تمہارا نام تو کبھی نہیں سننا۔“

”پھر میرا باپ کیا کما کر لایا؟“

”میری ماں کہا کرتی تھی کہ جب وہ آئے گا تب وہ بہت

سما سوتا لائے گا۔ مجھوں کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔" اس عورت نے سنبھل کر کہا۔ "تم میرے گھر جا کر کیس کرو گی؟"

"میں... زندگی کچھ اور نہ کہہ سکی۔

وہ عورت کو نکلوں کی ٹوکری پکڑا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تیرے لئے سونغات لائی ہوں"۔ زندگی نے زنگوں اور خوشبوؤں کی پیاری عورت کے سامنے رکھ دی۔

"نہیں بہن! تم ان کو اپنے پاس رکھو۔" عورت نے ڈرتے ہوئے ان سے اپنی نظر بھالی۔

"میں تیرے لئے لائی ہوں۔"

"نہیں بہن! اکل کو پولیس والے کہیں گے کہ تو نہ کسی کی چوری کی ہے۔"

وہ عورت جلدی جلدی اپنے گھر کی جانب مڑی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ اب بھی زندگی اس کے پیچھے آرہی ہے، وہ ڈر کے مارے کھڑی ہو گئی۔

"میری بہن! تو لوٹ جا، میرے ساتھ نہ آ۔ ججھے بیگانوں سے بہت خوب آتا ہے۔ پہلے بھی ایک بار... ایک جوان شہری آیا تھا اور کہتا تھا کہ میں تیرے خاوند کو کام دلا دوں گا۔ اور تیرے لڑکے کو جیل سے رہا کر دوں گا... میں نے پڑوسیوں سے آٹا لیکر اُس کی روٹ پکانی... اور جب میں اپنے لڑکے کو دیکھنے کے لئے

اس کے ساتھ شہر گئی... تو راستہ میں... راستہ میں...
اس عورت کے جسم کے ایک ایک عضو سے شعلے اٹھنے لگے اور وہ
بے نحاش بھاگ اٹھی۔

زندگی کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو ہوا نے اپنی
ہنفیل سے پونچھا۔ آ، میں تجھے تیسرا بہن کے گھر لے چلوں۔ جس وقت
زندگی ایک محل نما گھر کے آگے سے گزری تو ہوانے آہستہ سے اس کے
کان میں کہا۔ ”یہی اس کا گھر ہے۔“

دروازے پر کھڑے دربان نے زندگی کا راستہ روک لیا۔
اس کے بعد باندی کے ہاتھ پیغام بھیجا گیا۔ زندگی باہر انتظار
کرتی رہی... انتظار کرتی رہی۔ جب اُسے اندر آنے کی اجازت ملی تو
وہ خادم کے پیچھے پیچھے کئی بلوری دروازوں کو عبور کرتی ہوئی اور رشی
پر دوں کو اٹھاتی ہوئی خاص کمرے میں پہنچی۔

سنگ مرمر کا ایک مجسم کمرے کے ایک کولے میں ایسا دہ
تھا۔ پانی کی پھوار اس کے جسم کو ڈھانپ رہی تھی۔ سنگ مرمر جیسا ایک
اور عورت کا جسم زم کری پڑا تھا۔ رشیم کے تار اس کے جسم کو ڈھانپنے
کی کوشش کر رہے تھے۔ عورت کے کھڑے بُت کی کوئی آواز نہ آئی۔
لیکن بیٹھے ہوئے تجھے لے لو چھا ”تم کون ہو؟“ میں نئے تمہیں پہچانا ہاں۔

زندگی نے پدک کر چاروں طرف دیکھا، لیکن وہاں کسی عورت کا وجود نہ تھا۔ پھر زندگی نے کھڑے بُٹ کو ہاتھ سے چھووا۔ وہ پتھر کی طرح سُخت تھا۔ پھر زندگی نے بیٹھے ہوئے بُٹ کو ہاتھ لگایا۔ وہ رُٹ کی طرح ملا مُتم تھا۔

” مجھے زندگی کہتے ہیں۔ ” زندگی نے آہستہ سے کہا۔

” مجھے یاد نہیں آ رہا۔ لیکن یہ نام میں نے سُن رکھا ہے۔ شاید پہچان میں کسی کتاب میں پڑھا ہو۔ ”

” کتاب میں؟ ”

” ہاں مجھے یاد آگیا۔ میری ایک ہم جماعت تھی، وہ گیت لکھا کرتی تھی۔ ایک دفعہ اُس نے مجھے اپنے گینتوں کی کاپی دی تھی۔ اُس میں اس نام کا ذکر تھا۔ ”

” اب وہ کہاں رہتی ہے۔ ”

” غریب لڑکی تھی۔ نہ معلوم کہاں رہتی ہوگی؟ ”

” مگر اُس کی کاپی؟ ”

” اس نئی کوٹھی میں آلتے ہوئے میں پُرانا سامان نہیں لانا۔ ہم نے یہ سب سامان نیا خریدا ہے۔ ”

” بہت ہنگا خریدا ہے۔ ”

” مسیدا خاونڈ ملک کا ایک بہت بڑا آدمی ہے۔ اس دفعہ کے اتنا بات میں بھی مجھے لقین ہے کہ وہ دوبارہ بڑا آدمی، چنا جائے گا۔ ”

ہم جب چاہیں ایسا یا اس سے اچھا سامان خرید سکتے ہیں۔“ رپر جیسے ملائم مجھے نے میز پر پڑے ہوئے پھل زندگی کو پیش کئے۔ پھلوں کو باختہ لگاتے ہی زندگی کو بُو محسوس ہوئی۔

”میں نے ابھی ابھی یہ سچل اپنے نوکروں سے تڑوائے ہیں شاید خادم نے دھوئے نہیں۔ شاید تمہیں نوکروں کے ہاتھوں کی بُرُج آرہی ہوگی... آج گرمی... میری طبیعت کچھ شیک نہیں آج...“

”اگر تم کہو تو میں تمہیں باہر نکلی اور رُختِ خدمتی ہوا میں لے چلتی ہوں۔“ زندگی نے ایک سالانہ بھر کر کہا۔

”نہیں نہیں، میں ایسے باہر نہیں جا سکتی۔ اپنی برا درمی سے باہر کے لوگوں کے ساتھ گھومنے پھر لئے سے ہماری عزت میں فرق آتا ہے... درحقیقت جب میرا آپریشن ہوا تھا تو اس میں کچھ کسر رکھی تھی۔ کبھی کبھی مجھے درد ہوتا ہے...“

زندگی نے انھوں کو اس رپر جیسی ملائکم عورت کا بازو دیکھا اور پھر اس کے جسم پر ہاتھ رکھا ”تمہارا دل کیوں نہیں دھڑکتا؟ ... پھر کسی طرح خاموش اور صرد ہے ...“

”پہل پر ہی تو نقص رہ گیا ہے میرا خاوند کہتا ہے کہ اپ کے
ہم کسی دوسرے دیس جائیں گے ... بٹا یاد مرکیہ ... دہلی کے
ڈاکٹر بہت لائق ہیں میرا آپریشن دوبارہ ہو گا۔“

”کاہے کا آپریشن؟“

”جب کوئی لڑکی شادی کردا کہ بڑے گھر“ میں آتی ہے تو شادی سے پہلی رات ملک کے عقائد و اخلاق اس کا آپریشن کرتے ہیں۔ یہ بڑے گھروں کی رسم ہے۔“

”شادی کی رات یہ آپریشن ...“

”ہاں! اس لڑکی کے جسم کو چیز کہ اس کا دل باہر کال لیتے ہیں اس کی جگہ ایک سونے کی سل رکھ دیتے ہیں۔ بہت خوبصورت... بہت مہنگی... میرے آپریشن میں ذرا سی کسرہ گئی تھی کبھی کبھی درد اٹھتا ہے... ان انتخابات میں اگر میرا خاوند چیت گپا تو ہم اگلے چینے ہوائی جہاز میں باہر جائیں گے پھر میرا آپریشن ہو گا اور میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

”میں تیرے لئے ایک سو غات لائی ہوں۔“

”نہیں۔ نہیں... میرے خاوند نے مجھے کہہ رکھا ہے کہ آج کل میں کسی سے کوئی بھینٹ قبول نہ کروں۔ انتخابات نزدیک ہیں اور اس کے علاوہ ملک کی بڑی بڑی ملوں میں ہمارے حصے ہیں ہمیں یہ چھوٹی چھوٹی چیزوں لیئے کی کیا ضرورت ہے؟“

ٹیکی فون کی گھنٹی بجی۔ رہبر جیسی ملامت عورت نے ٹیکی فون پر دو تین منٹ باٹیں کر کے قریب بیٹھی ہوئی زندگی سے کہا ”بہن اگر تمہیں میرے ساتھ کوئی کام ہو تو پھر تشریف لانا۔ اس وقت میرا خاوند اور اس کی پارٹی کے کچھ کن ہمارے ہاں آ رہے ہیں...“

ہوا لے زندگی کے ہاتھ کو سخما اور اسے سہارا دے کر چھپتی
بہن کے گھر لے گئی۔ پڑا سادہ گھر تھا۔ گھر کے دروازے کے سامنے ایک
چمکتی ہوئی گاڑی کا موñہ آنکھوں کو چند صیار ہاتھا۔ رات کی آمد آمد
تھی۔ زندگی نے دلپیز کے قریب ہو کر اندر جھانکا۔ باپیس تیس سال
کی ایک جوان عورت ایک بچے کو تھیکیاں دے کر مُلا رہی تھی۔ مگرے
کاساہان صرف گزارے گئے کافی تھا۔ اس جوان عورت کے کپڑے
چھٹا لارہے تھے۔ زندگی نے آہستہ سے دروازے کو لکھا کھٹایا۔

”کون... ذرا آہستہ“۔ جوان عورت دلپیز کے پاس
آئی۔ ”بچہ جاگ اٹھے گا۔“ پھر جوان عورت نے پدک کر کہا ”تم...
تم؟“ اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

”بچہ زندگی کہتے ہیں؟“

”بچہ علم ہے؟“

”بچہ علم ہے؟“

”میں نہاں عمر تیری پر چھائیوں کے پیچھے دوڑتی رہی ہوں،
اب میں متک گئی ہوں۔ اب میں نے تیری راہ ترک کر دی ہے۔ تم
چلی جاؤ... جہاں سے آئی ہو وہیں چلی جاؤ۔ تم دیکھتی نہیں ہو...
میرے دروازے کے آگے عذاب کی ایک لیکر کھجی ہوئی ہے۔ تم اس

لکیر کو پار نہیں کر سکتیں۔ تم اس لکیر کو نہیں مٹا سکتیں۔ تم چلی جاؤ...
... تم چلی جاؤ...”。 جوان عورت کا سانس سچول گیا۔

”میری اچھی بہن“

”بہن؟ میں کسی کی بہن نہیں۔ میں کسی کی لڑکی نہیں۔ میں
کسی کی کچھ نہیں...“

”یہ تیرا بچہ...“ زندگی نے مکرے میں سوئے ہوئے بچے کو
دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا بچہ... میرا بچہ... مگر اس کا باپ کوئی نہیں“

”میں نہیں سمجھی۔“

”جب میرے دلیں میں آزادی کی بنیادیں رکھی گئیں تو ان میں
میری ہڈیاں ڈالی گئیں... جب میرے ملک میں آزادی کا پودا
لگایا گیا تو میرے خون کے پانی سے اسے سینچا گیا... جس رات میرے
دلیں میں خوشی کا چکر اغ روشن ہوا اُس رات میری عزت اور آبرو کے
دامن کو آگ لگی... یہ بچہ... یہ بچہ اُس رات کا تحفہ ہے۔ اُس
آگ کی راکھ ہے۔ اس زخم کا نشان...“

”میری دکھی بہن...“ زندگی نے ہمدردی سے جوان عورت
کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”پھر میری تمام راتیں اس رات جیسی ہو گئیں۔ میں تیرے خواب
دیکھا کرتی تھی میں نتے سوچا کہ تو میرے سپنوں کو چہندی لگائے گی۔“

میری ماں کے آنگن میں میرے دلیس کے گیت گائے جائیں گے۔ اور پھر پہنچ اپنے کاؤں سے شہر ہنا یوں کی دھنیں سُنؤں گی۔ میرے گاؤں کا ایک کڑبیل جوان لڑکا میرے سپنوں کا راجہ تھا... میں تیری پرچھا یوں سے کھیل رہی تھی۔ جب ہمارا گاؤں لوٹا گیا۔ جب میرے والد کو پیٹا گیا۔ جب میرے بھائیوں کو تہ تینغ کیا گیا۔ ایک سانپ نے مجھے بھی ڈس لیا۔ پھر ایک اور سانپ نے... ایک اور نے... یہ انسانی چہروں والے سانپ کس ڈھنگ کے ہیں۔ جن کا کام مرتا نہیں، ساری عمر اُس کے زہر میں جلتا رہتا ہے... پھر میں نے تیرا ایک اور سایہ دیکھا۔ میرے دلیس کے لوگ کہنے لگے کہ مجھے ان سانپوں سے بچا کر لایا جائے گا... ان کا زہر میرے جسم سے آثار دیا جا۔ ”گا میں دوبارہ پہلے سی اچھی اور پاک لڑکی بن جاؤں گی... میں دوڑی تیری پرچھا یوں کے پیچے... یہ سب جھوٹ تھا... میرے خوابوں کے شہزادے نے مجھے قبول نہیں کیا۔ مجھے اپنی دہلیز سے لوٹا دیا۔ مجھے اپنے پاؤں سے علیحدہ کر دیا۔ پھر اُس زہر میں سڑنے لگی۔ ان سانپوں بھیسے اور سانپ میرے گرد لپٹ گئے۔ تم باہر وہ گاڑی نہیں دیکھ رہی ہو؟ کتنی چمکتی ہے، یہ ایک بہت بڑے سانپ کی گاڑی ہے۔ آج رات یہ مجھے کاٹی۔“ زندگی بول نہ سکی۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سوغات اس کے آنسوؤں میں بھیگ گئی۔

” یہ تم کیا لائی تھیں۔ سوغات... میرے لئے؟ تم دیکھنیں

رہی ہو، میرا سارا جسم زہر آلو دھے۔ میں جب تمہاری سو غات کو ہاتھ لگاؤں گی، اس کو زہر حڑھ جائے گا۔ ان رنگوں کو، ان خوشبوؤں کو... میری نش نش میں زہر سے مایا ہوا ہے۔ زہر ازہر!“

ہوا نے بے ہوش زندگی کے موئیہ پر اپنے دامن سے ہوا کی۔ جب زندگی کو کچھ ہوش آیا تو ہوا اسے پانچویں بہن کے ہاں لے گئی۔ بیس سال کی ایک مدھ بھرے نینوں والی لڑکی کے ارد گرد بڑی کتابیں، ساز اور رنگ بجھرے پڑے تھے۔ زندگی نے اٹھیان کا ناس لیا۔ اس کے ساتھی متوارے نینوں والی لڑکی نے ساز کے تار چھپیرے اور ایک بیٹھاگیت فضاوں میں لہرا اٹھا۔ وہ لڑکی گاتی رہی۔ ستاروں جیسے آنسو اس کی آنکھوں میں چمکتے رہے۔ پھر اس نے رنگوں کی پتلی لکیر سے کاغذ پر ایک رنگیں تصویر بنائی۔

زندگی کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس فن کار لڑکی کے ہاتھوں کو چوہم لے۔

سروں کا، الفاظ کا اور لفظتوں کا ایک چادو فضاوں میں گھلا ہوا تھا۔ زندگی نے ایک گھری سانس لی۔ ہاتھوں میں رنگوں اور خوشبوؤں کی ٹپاری لے کر آگے بڑھی۔

لڑکی نے جیرانگی سے دیکھا۔

” مجھے زندگی کہتے ہیں ۔“

” مجھے علم ہے“ رٹکی نے کہا، مگر وہ اس کے سو اگت کے لئے آگے نہ بڑھی۔

اچانک زندگی کے پیروک گئے۔ لوہے کی باریک تاریں در داڑھے کے آگے بنی ہوئی تھیں۔

” میں اس وقت تمہارا خیر مقدم نہیں کر سکتی ۔“ رٹکی نے صرخ جھکا کے کہا۔

” کیوں؟“ زندگی حیران تھی۔

” اگر تم کبھی رات کو آؤ، جب میں سو جاؤں، میرے سپینوں میں ... جب میں جاگ رہی ہوں تو میرے جذبات میں، میں تیرے ساتھ بہت باتیں کروں گی، بہت کچھ ستھناؤں کی اور سُناؤں کی۔ پہلے بھی میں ہر روز تیری پر چھائیوں کو پکڑتی تھی۔ یہ دیکھو میں نے ان زنگوں سے تیرے دامن کی تصویر کھینچی ہے۔ ان تاروں کو کھینچ کر تیرے گیت گائے ہیں۔ اور اس قلم سے میں نے تیرے پیار کے قصتے پیان کئے ہیں ۔“

آنچ جب میں خود چل کر تمہارے پاس آئی ہوں تو تم ...“

” آہستہ ... بہت آہستہ ... میرے گھر کی سب دیواروں میں سوراخ ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں آنکھیں میری نگہبانی کرنی ہیں۔ وہ دیکھو ان سوراخوں میں ہر سوراخ سے دو بھیانک آنکھیں نظر

آئیں گی۔ یہ آنکھیں لاوے سے بھری ہوئی ہیں۔ اور ایک ایک زبان سے سینکڑوں تیر نکلتے ہیں۔ اگر میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں۔ تمہارے پاس... تو ان کے تیر ابھی مدیکر رنگ کے پیالوں کو اونٹ کر دیں گے۔ مدیکر سازوں کے تاروں کو توڑ دیں گے مدیکر گیتوں کے ایک ایک لفظ کو زخمی کر دیں گے۔ اور ان آنکھوں کا لاوا... ”

”مگر یہ لوگ تیر کے گیت سُننتے ہیں۔ تیری کہانیاں پڑھتے ہیں۔ تیری تصویروں کو دیکھتے ہیں۔“
”یہاں کے فن کار تیری باتیں کر سکتے ہیں۔ مگر تیرا چہرہ نہیں دیکھ سکتے۔ جو تیرا چہرہ دیکھ لیتا ہے، اس منصوّر کو دار پر چڑھا دیتے ہیں۔ تم اب چلی جاؤ۔ کوئی دیکھ لے گا۔ مدیکرے خوابوں کے علاوہ میرے پاس کوئی اور حبکہ نہیں جہاں میں تمہیں بیٹھا سکوں۔“

”میں تیرے لئے ایک سوغات لائی ہوں۔“
”وہ بھی میں اس وقت لوں گی۔ تم ضرور آنا، میں سات بہشتیں تعمیر کروں گی زندگی، تم ضرور آنا۔ میں تمہاری سوغاتوں سے اپنی بہشتیں کو سجاوں گی۔ تم ضرور آنا... اور صیح اٹھ کر میں تمہاری محبت

کا لفڑ کہ لکھوں گی۔ تیرے ہسن کی تصویر کشی کروں گی۔
تیرے بانکپن کا میں گیت گاؤں گی۔ مکھا ب تم چلی جاؤ
... کوئی دیکھ لے گا۔
لڑکی نے زندگی کی طرف اپنی پیٹھ پھیر لی۔